توسیعی خطباتِ اسلامیہ کا سلسلہ

اور

موجودہ مدنی مسائل

از

حضرت مولانا حکیم ابو البرکات محمد عبد الرؤف صاحب دانا پوری

توسیعی خطباتِ اسلامیہ کا سلسلہ

اسلام

اور

موجودہ مدنی مسائل

یعنی

وہ مقالہ جو مولانا حکیم محمد عبدالرؤف صاحب داناپوری

نے ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۳۱ عیسوی کو

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اساتذہ و طلبہ کے سامنے پڑھا

اور

مجلس دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شایع کیا
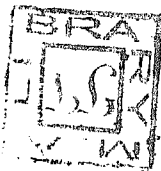
قیمت فی جلد ۸ر
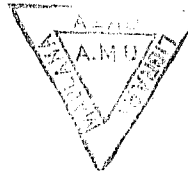
تعارف

جامعہ ملیہ اپنے تعلیمی ادارے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک کرنا چاہتی ہے اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے ایک سلسلہ توسیعی خطباتِ اسلامیہ کا شروع کیا ہے، بعض مقتدر علماء و پیشوایانِ ملت نے ہماری درخواست پر ارزانی فرمائی اور اپنے خطبات پڑھ کر طلبہ و اساتذہ جامعہ اور عام اہل دہلی کو اپنے قیمتی خیالات سے مستفیض فرمایا۔

یہ خطبہ اسی سلسلہ کی ایک قابل قدر کڑی ہے، اس کی اشاعت جناب حاجی حافظ محمد صالح صاحب کوٹھی حاجی علی جان (مرحوم) نئی سڑک دہلی کے لطف و کرم کا نتیجہ ہے جس کے لئے شعبۂ دینیات اُن کا شکر گزار ہے۔

صاحب خطبہ مولانا حکیم محمد عبد الروف صاحب کا خاص احسان ہے کہ آپ نے ہماری درخواست قبول کر کے زحمت سفر گوارا فرمائی۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

عبد الحی
ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تمہید

جدید تمدّن نے بہت سے مذہبی مسائل کو مابہ النزاع بنا دیا ہے، اور اسی طرح بہت سے اسلامی تعلیمات بھی موضوع بحث بن گئے ہیں، مثلاً ربوا، وراثت کا طریقہ، بیوع کی قسمیں، رہن، ملک، اور اجارہ کی بعض صورتیں، کثرۃ ازدواج کا مسئلہ، نکاح وطلاق، عورتوں کے حقوق کی تعیین، پردہ اور عورتوں کے فرائض، غلامی کے جواز کا مسئلہ، اسی طرح عبادات جس کو مذاہب نے انسان کے لئے ضروری قرار دیا تھا، جدید تمدّن اس کو قبول نہیں کرتا، یا ایسے اعتقادات جس کو موجودہ تمدن برداشت نہیں کرسکتا، جیسے حشر ونشر، یا لوح وقلم، اور جنّت ودوزخ کا مستقل وجود، یا روحانیات ومجردات کا وجود جیسے ملائکہ، جنات، اور شیاطین وغیرہ، یا خارق عادت چیزوں کا صدور جیسے معجزات، کرامات، استدراج، وسحر،

یہ وہ مسائل ہیں جن کی بنا پر علماء یورپ نے اسلام بلکہ تمام مذاہب پر اعتراضات کئے ہیں، اور موجودہ "مدنی مسائل" سے وہی باتیں مراد لی جاسکتی ہیں جو علماء یورپ کا خیال ہو، اس لئے کہ موجودہ تمدن کے وہی بلاشرکت غیرے مالک ہیں،

ان مباحث پر گفتگو کی آسان صورت یہ تھی کہ علماء یورپ کے خیالات کو مسلم مان کر یہ کہدیا

جاتا کہ اسلام بھی یہی کہتا ہے، قرآن پاک کی آیتیں، رسول اللہ کی حدیثیں، یا فقہاء مذاہب کے فتاوے اگر خلاف ہوتے تو اس کی تاویل کر دی جاتی، اور جہاں تاویل نہ بنتی وہاں اس کے ثبوت ہی سے انکار کر دیا جاتا، اور اسناد و روایات میں کسی طرح جرح کر دی جاتی۔ جس طرح ہم سے پہلے بعض ''روشن خیال'' علماء نے کیا ہے، اور اپنے خیال میں انہوں نے یہ بہت بڑی اسلامی خدمت انجام دی ہے کہ اسلامی تعلیمات کو یورپ کے خیالات سے متفق کر دیا ہے، اور اس طرح اسلام پر اعتراضات کا سدّباب کر دیا ہے۔

یورپ کو اس وقت ایشیا اور دنیائے اسلام کے مقابلہ میں جس طرح کا علمی اور اقتصادی تفوق حاصل ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے تو غالباً اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا، ماہرین عقلیات کے مقابلہ میں ان بے چاروں ''روشن خیالوں کو'' تسلیم کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ جواب کافی نہیں ہے،

جدید تمدن ہر طرح کی اخلاقی اور دنیاوی رہنمائی کے لئے انسانی عقل کو کافی سمجھتا ہے، اس لئے مذہب کی پیروی سے یا کسی حکم کو حکم خداوندی سمجھ کر عقول کی وسعت کو محدود کرنا جدید تمدن برداشت نہیں کر سکتا، لہذا فیصلہ طلب صرف یہ جزوی مسائل ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ طے کرنا ہے کہ آیا مذہب کو یہ حق ہے یا نہیں کہ ہمارے عقول کے دائرہ کو محدود کرے،

موجودہ تمدن

سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ ''موجودہ تمدن'' سے کیا مراد ہے، یہ خود ایک بڑا وسیع مضمون ہے، مگر جہاں تک میرے موضوع کا تعلق ہے میں جدید تمدن کے بہترین پہلو کو پیش نظر رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ جدید تمدن یہ ہے کہ انسان علم، اعتقاد اور عمل میں آزاد ہو، عقل کی ہدایت پر عمل کر سکے، رسم و رواج، ملکی و قومی عادات، یا مذہبی احکام کی بنا پر کوئی شخص خلاف عقل اعتقاد یا عمل پر مجبور نہ کیا جائے۔

اس بات کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جدید تمدن کے حاملین کا سارا عمل واقعی

عقل صحیح کے موافق ہوتا ہے، تاہم علمی حیثیت سے جدید تمدن کا بہترین روشن پہلو یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے اعتقاد و عمل کا معیار عقل صحیح کو قرار دیتا ہے، اور اسی معیار پر وہ مذہبی اعتقادات اور مذہبی اعمال کو بھی جانچتا ہے، اور خلاف عقل باتوں کا انکار کر دیتا ہے۔

کوئی سمجھ دار شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان اچھی اور بُری باتوں میں، سچ اور جھوٹ میں، حق اور ناحق میں تمیز عقل ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے، اور دنیا کے مذاہب مختلفہ کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ بھی عقل ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، تمام مقبول مذاہب بھی معقول باتوں ہی پر عمل کی ہدایت کرتے ہیں، اور نامعقول باتوں سے بچنے کا حکم دیتے ہیں، لیکن مذہب سے آزادی حاصل ہونے کے بعد تقویٰ اور تزکیۂ نفس کا خیال مٹ گیا ہے، فسق و فجور اور بے حیائی و بے شرمی عام ہو گئی ہے، لہو و لعب، ہنسی تفریح، عیش و تنعم زندگی کا اصل مقصد قرار دیدیا گیا ہے، بڑے سے بڑا مکان بنانے کی خواہش، اپنی طرح کے انسانوں کو غلام بنا کر حکومت کرنے کا خیال، زیادہ سے زیادہ مہلک طاقتوں کا فراہم کرنا، درندوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کرنا اور لڑنا زندگی کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جانے لگا ہے، کیا یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ انسان مذہب کو چھوڑ کر عقل صحیح کی پیروی کر رہا ہے، اور کیا عقل صحیح اسی طرح کی زندگی کی ہدایت کرتی ہے، نہیں، کوئی ذی عقل یہ رائے قائم نہیں کر سکتا، یہ ساری باتیں عقل کی نہیں ہیں، مگر باوجود اس کے یہ سب جدید تمدن کے اصلی اجزاء ہیں۔

اصل یہ ہے کہ یورپ نے واقعی عقلیات کی طرف توجہ کی، صنائع اور علوم میں انقلاب عظیم پیدا کیا، میکانیکل ترقی اور مشین کی ایجاد نے تمام صنعتوں کی حالت بدل دی، اور تقریباً تمام دنیا کے دستکار بیکار ہو کر رہ گئے، چین، ہندوستان، مصر اور ایران وغیرہ قدیم صنعتی ممالک تھے، بہت سی صنعتوں کے بڑے بڑے ماہرین اور اساتذہ ان ممالک میں پائے جاتے تھے، اور ملک کی تمام ضروریات کو خود ملک کے کاریگر فراہم کرتے تھے، وہ ملک اب اس قابل نہ رہے کہ یورپ کی امداد کے بغیر اپنا ستر بھی ڈھانپ سکیں۔

اس کے بعد برقی قوت کا حال دریافت ہوا، اور اس سے ایک اور انقلاب پیدا ہوا، دنیا کا رنگ پلٹ گیا، یہ دونوں چیزیں یورپ کے قبضہ میں تھیں، اور دراصل انہیں دو طاقتوں کے ذریعہ سے تمام دنیا کی دولت سمٹ کر یورپ اور امریکہ میں جمع ہوگئی۔

دنیا کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے کہ دولت کی کثرت کے بعد نہ مذہب کا خیال باقی رہتا ہے نہ عقل کا، یہی حال یورپ اور امریکہ کا ہے، وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دولت کی کثرت کا کرشمہ ہے، عقل کا نہیں، بلاشبہ وہاں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے دولت سے عاقلانہ کام لیا ہے، یہ پہلے سے معلوم تھا کہ اپنے اپنے زمانہ میں مصر، ایران، یونان، اور روم نے علوم عقلیہ کو بڑی ترقی دی تھی، اور پھر مسلمانوں نے اپنے وقت میں ان سب کے علوم کو جمع کیا تھا، اور اوس کو بہت عروج تک پہونچا دیا تھا، پھر جب یہ سارے ممالک اقتصادی تباہی میں مبتلا ہوگئے، اور ان بیش قیمت علمی خزانوں کی نگرانی بھی نہ کر سکے تو نتیجہ یہ ہوا کہ علوم و فنون کا یہ ذخیرہ جو ہندوستان، چین، ایران، عراق، مصر، شام وغیرہ ممالک میں منتشر طور پر پرانے پرانے برباد شدہ خاندانوں کے حجروں میں بے وقعت کتابوں کی شکل میں پڑا ہوا تھا، یا ہندوستان، بغداد، اندلس، تونس کے تباہ کتب خانوں سے نکل کر بے قدر ہاتھوں میں پھیل گیا تھا، اور یہی چیزیں تھیں جن پر کسی ترقی یافتہ تمدن کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی ان سب علمی خزانوں کو ان عقلمندوں نے جمع کیا، اور وہی ان کے علوم عقلیہ کی ترقی کا سب سے بلند مینار بنا۔

اس طرح یورپ میں اس وقت متضاد عناصر اور متخالف معاشرت پھیلی ہوئی ہے، جو لوگ علوم عقلیہ اور فنون کو ترقی دے رہے ہیں، اُن کی معاشرت اور اُن کا تمدن جدا ہے، اور جو لوگ دولت کی کثرت سے مخمور ہو کر فسق و فجور اور لہو و لعب کو ترقی دے رہے ہیں، وہ دوسرے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ ایسے لوگ جو یورپ کے عیوب ہی نقل کر رہے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو جدید تمدن کا حامی سمجھتے ہیں اور ان خرافات کو بھی عقل ہی کا نتیجہ بتاتے ہیں، حالانکہ عقل صحیح اور مذہب میں بہت تھوڑا فرق ہے جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔

علم

اتنی بات بدیہی ہے کہ انسان مختلف طریقوں سے بے انتہا چیزوں کا ادراک کرتا ہے، لیکن ادراک کے ذرایع دراصل صرف پانچ ہیں، جن کو حواس خمسہ کہتے ہیں، یعنی باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، ان پانچ حواس سے پانچ قسم کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے، اس کے سوا چھٹی قسم کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا، حس کی یہ پانچ قسمیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، اگر کسی شخص کو ان میں سے ایک حس پیدائشی نہ ہو تو وہ اس طرح کے علم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ایک شخص اندھا پیدا ہوا تو وہ کسی طرح سفیدی، سیاہی، زردی، سرخی کے فرق کو سمجھ نہیں سکتا، اوس میں عقل بھی موجود ہے، اور حس ادراک کے دوسرے ذرایع بھی موجود ہیں، مگر نہ خود اوس کی عقل اس فرق کو سمجھ سکتی ہے، نہ کوئی نبی، ولی یا فلاسفر اس کا پورا پورا فرق سمجھا سکتا ہے، اگر وہ اس فرق کا اقرار کرتا ہے تو یہ اقرار محض تقلیداً ہے، ورنہ فی الواقع وہ اس فرق کو نہیں جانتا ہے، اور نہ جان سکتا ہے، حالانکہ آنکھ والوں کے نزدیک یہ فرق اتنا بدیہی ہے جس میں شبہہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے۔

یہی حال دوسرے حواس کا ہے، جس قسم کا علم جس حاسہ سے حاصل ہوتا ہے وہ حاسہ پیدائشی کسی میں نہ ہو تو اوس طرح کا علم کسی اور ذریعہ سے اوس کو قطعاً حاصل نہیں ہو سکتا۔

علم کا ایک ذریعہ اور ہے جس کو عقل کہتے ہیں، عقل کے ذریعہ سے انسان غیر محسوس چیزوں کو جان لیتا ہے، لیکن اوس کے ذرایع بھی محسوسات ہی ہوتے ہیں، عقل کا کام یہ ہے کہ حواس کے ذریعہ سے جو علوم اور ادراکات حاصل ہوتے ہیں اونہیں کو مقدمہ بنا کر ایسا نتیجہ نکال لیتا ہے جو محسوس نہیں ہوتا، مثلاً انسان نے دیکھا کہ لکڑی پانی پر تیرتی ہے، اس سے نتیجہ نکالا کہ اگر تختوں کو جوڑ کر کشتی بنائی جائے تو وہ انسان اور انسانی ضروریات کو پانی کے اوپر ادہر اودہر لے جا سکتی ہے، انسان کو غور و فکر سے معلوم ہوا کہ تختہ اس لئے پانی میں نہیں ڈوبتا کہ اس کے تخلخل میں ہوا ہوتی ہے، اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہوا کی زیادہ جگہ اگر وزنی دہات میں رکھی جائے تو وہ بھی نہیں ڈوبیگا، اس طرح بڑی بڑی کشتیاں اور بڑے بڑے جہازات بنا لئے۔

انسان نے دیکھا کہ آفتاب، ماہتاب ایک مقررہ مقدار پر حرکت کر رہے ہیں، اور غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے راستے بھی معین ہیں، پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے راستوں کا ثور پر تقاطع ہوتا ہے، اور جب تقاطع کی جگہ دونوں جمع ہو جاتے ہیں تو گرہن لگتا ہے، اسی طرح حساب مرتب کر کے گرہن کی پیشین گوئیاں کرنے لگے، اور رفتہ رفتہ علم ہیئۃ کا وسیع فن بنالیا۔

الغرض حس، تجربہ اور قیاس کی مدد سے انسان نے علوم و فنون اور حکمت و انسانیت کو اس حد تک پہونچا دیا جس کی تحدید ناممکن ہے۔

علوم عقلیہ کے اقسام

میں نے عرض کیا کہ حس اور ادراک کے ذرائع صرف چھ ہیں، پانچ حواس اور ایک عقل، حواس خمسہ دوسرے حیوانات میں بھی ہیں، انسان میں صرف ایک چیز زیادہ ہے عقل، اور اسی عقل کے کرشمے ہیں وہ تمام علوم و فنون جنہوں نے انسان، انسانی طاقت، اور انسانی اختیارات کو اس درجہ بلند کر دیا ہے کہ تمام مظاہر قدرت اوس کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔

عقل کی مدد سے جو علوم انسان نے ایجاد کئے ان کے انواع اور اقسام کی حد نہیں ہے، من حیث المجموع ان کی سات قسمیں ہیں:-

اوّل منطق، علم منطق کچھ قواعد کے مجموعہ کا نام ہے جس کو ملحوظ رکھنے سے انسان خطا فی الفکر سے بچتا ہے۔

دویم العلم الطبعی، اوس علم کو کہتے ہیں جس میں محسوسات پر بحث کی جائے جیسے اجسام عنصری، اجسام مکنونہ، اجسام نباتیہ، اجسام حیوانیہ، اجسام فلکیہ، حرکات طبعیہ، اور نفس پر اس حیثیت سے کہ وہ حرکت و سکون کا مبدء ہے۔

سویم الٰہیات، یہ اس علم کا نام ہے جس میں روحانیات پر بحث ہوتی ہے، یعنی ایسی چیزوں پر جو ماوراء الطبعیۃ اور غیر محسوس ہیں۔

تین۳ یہ اور اس کے علاوہ علم المقادیر کی چار قسمیں ہیں جو چار تعلیمات کے نام سے مشہور ہیں،

اور وہ چار یہ ہیں :-

اوّل علم ہندسہ، مطلق مقادیر کی بحث کو علم ہندسہ کہتے ہیں، اوس کی دو قسمیں ہیں :

(۱) اگر کم منفصل پر بحث ہو تو علم الاعداد ہے۔

(۲) اور کم متصل پر بحث ہو تو اقلیدس ہے جیسے خط، سطح، اجسام تعلیمی وغیرہ۔

دویم علم الارتماطیقی، جس میں مقادیر منفصلہ کے خواص وعوارض پر بحث ہوتی ہے۔

سویم علم موسیقی، جس میں اصوات اور نغموں کی کمیت اور نسبت سے بحث ہوتی ہے۔

چہارم علم ہیئتہ، جس میں افلاک کے اشکال، اوضاع، حرکات اور منازل وغیرہ سے بحث ہوتی ہے۔

علوم عقلیہ کی یہ سات قسمیں ہیں، لیکن ان سے بہت سے شعبے نکلے جو خود بڑے وسیع اور مستقل علوم ہیں جیسے :

طبعیات سے علم طب، علم الادویہ، علم المعادن، علم نباتات، علم حیوانات، علم الاحجار، علم الافلاک، اور سائنس کی بے شمار قسمیں۔

علم الاعداد سے علم حساب، فرائض، معاملات اور دوسری بے شمار قسمیں۔

علم ہیئتہ سے علم نجوم، علم الارصاد، زائچہ کا حساب وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک بڑا وسیع علم ہے، اور بے انتہا مسائل کو حاوی ہے، پھر ان شعبوں سے بہت سے مستقل فروع نکلے ہیں، جو خود مستقل ناموں سے موسوم ہیں، ان سب کو ملا کر علوم عقلیہ کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے جس کی تحدید نہیں ہو سکتی۔

پھر انسانی عقول نے ان علوم کی مدد سے ساری دنیا کا نقشہ پلٹ دیا، صنائع اور حرفتوں کا جال بچھا دیا، کھانا، پینا، سونا بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھیل تماشے، مسرت وغم، اور ہر کام کے لئے مصنوعات کی الگ دنیا بنالی، مختلف عمر، مختلف حالات، مختلف مدارج، مختلف طبقات اور مختلف ممالک اقوام کے لئے علیحدہ علیحدہ اصول و قواعد، اور جدا طرز معاشرت قائم ہو گئی، دوربین

کی ایجاد سے قوت باصرہ، اور ٹیلیگراف و ٹیلیفون کی ایجاد سے قوت سامعہ نے اتنی ترقی کرلی کہ انسان معجزہ کا پتلا بن گیا، ریل، جہاز اور ہوائی جہاز نے انسان کو طی الارض کا معجزہ عطا کردیا۔

الغرض عقل وہ عطاء الٰہی ہے جس کی قوت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اگر انسان عقل سے محروم ہو تو اوس کا مرتبہ ایک معمولی چوپایہ سے زیادہ نہیں ہے، اور وہی انسان عقل سے کام لے تو پھر اوس کی طاقت اور کمال کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

علوم عقلیہ کے مدارج

جتنے علوم و فنون کا اوپر ذکر ہوا، یہ سب کے سب علوم عقلیہ یا اوس کے نتائج ہیں، باوجود اس کے دلائل اور نتائج کے اعتبار سے ان سب کا مرتبہ ایک نہیں ہے۔ بعض علوم وہ ہیں جن کے دلائل اور مسائل سب یقینی ہیں، اس میں مطلق شبہہ کی گنجائش نہیں ہے، بعض وہ ہیں جن کا علم ظنی ہوتا ہے، اور شبہہ سے پُر ہوتا ہے، بعض وہ ہیں جن کے مسائل بظاہر بڑے قوی اور دقیق دلائل پر مبنی ہیں، اور اُون کو یقینیات کا مرتبہ بھی دیدیا گیا ہے مگر درحقیقت وہ صحیح نہیں ہیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ عقل کا کام یہ ہے کہ محسوسات کو مقدمہ بناکر اوس سے نتائج اخذ کرتا ہے، جو علم محسوسات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ بدیہی ہوتا ہے، اگر حواس صحیح ہوں گے تو یہ علوم بھی صحیح ہوں گے، اس صحیح علم میں غور و فکر کے بعد جو نتیجہ نکلے گا اوس نتیجہ کی صحت بھی اگر محسوس طریقہ سے جانچی جاسکے تو ایسے نظری و عقلی علوم کی صحت میں شبہہ کی گنجائش نہ ہوگی، مثلاً علوم ہندسہ کہ اوس کے تمام نظری نتیجے بھی محسوس طریقہ سے جانچے جاسکتے ہیں، اسی لئے علوم ہندسہ تمام علوم عقلیہ میں باعتبار صحت اولیّت کا مرتبہ رکھتے ہیں، ہندسہ کے تمام مسائل بلاشبہ یقینی اور صحیح ہیں۔

علوم طبعیہ کا درجہ اوس کے بعد ہے، بعض علوم طبعی کے مسائل مشاہدہ پر کلیتاً مبنی ہیں، بعض ایسے ہیں جن کے مسائل زیادہ تر قیاسات پر مبنی ہیں مگر تجربہ اور مشاہدہ کی مدد سے اون قیاسات کو یقینیات کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، طب اور سائنس کی اکثر قسمیں اسی طرح کے مسائل پر مبنی ہیں،

لیکن طبعیات میں جہاں حقائق پر بحث ہوتی ہے وہ مسائل الٰہیات کی طرح بالکل قیاس ہی قیاس رہ جاتے ہیں، مثلاً یہ بات ابتک یقینی طور پر طے نہ ہوسکی کہ اجسام مفردہ کی ترکیب کس طرح ہے، جواہر فرد کیا ہیں؟ اجزاء لایتجزی کا وجود ممکن ہے یا نہیں؟ اجسام مفردہ اجزاء متناہیہ سے مرکب ہیں یا غیر متناہیہ سے، ذرا اس کے متعلق اصحاب عقول کے مذاہب پر غور فرمائیے:

۱۔ حکماء کا مسلک ہے کہ اجسام مفردہ میں اجزاء بالفعل بالکل نہیں ہیں، بالقوہ ہیں، اور غیر متناہی ہیں۔

۲۔ محمد شہرستانی کا مذہب ہے کہ اجسام مفردہ میں اجزاء بالفعل نہیں ہیں، بالقوہ ہیں، اور متناہی ہیں۔

۳۔ متکلمین کا مذہب ہے کہ اجسام مفردہ میں اجزاء بالفعل متناہی ہیں، اور ایسے اجزاء ہیں جن کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔

۴۔ نظام کا مسلک ہے کہ اجسام مفردہ میں بالفعل اجزاء غیر متناہیہ ہیں، اور ایسے اجزاء ہیں جن کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔

۵۔ حکیم ذیمقراطیس کا مذہب ہے کہ اجسام مفردہ اجسام صغار قابل الانقسام سے مرکب ہیں۔

۶۔ بعض کہتے ہیں کہ اجسام مفردہ بالفعل اجزاء قابل الانقسام ہیں مگر وہ اجسام صغار نہیں ہیں۔

بعض متکلمین کہتے ہیں کہ اجسام مفردہ سطوح سے مرکب ہیں، اور سطوح خطوط سے اور یہ صرف جسم تعلیمی ہی نہیں جسم طبعی بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیال کو یقینی اور دوسرے کو باطل کہا ہے، اور اس پر بہت سے دلائل قائم کئے ہیں، مگر یہ سب دلائل وہم اور قیاس محض ہیں، مشاہدہ کسی دلیل کا معاون نہیں ہے، آج حکماء یورپ کی ایک جماعت اجزاء ذیمقراطیسی کو اصول قرار دیکر تخلیق عالم کی ایک تصویری پیش کر رہی ہے مگر وہ بھی اسی طرح قوت واہمہ کی پیداوار ہے، توہمات سے زیادہ اس کی بھی کچھ حیثیت نہیں ہے۔

علم ہیئۃ اور فلکیات کا بھی یہ حال ہے کہ آج تک ایک بات بھی یقینی طور پر ثابت نہ ہوسکی،

بطلیموس کی کتاب مجسطی کا بیت الحکمۃ بغداد کی طرف سے ترجمہ ہوا تو اس کے زوردار دلائل اور دقیق معلومات نے علماء کو محو حیرت کر دیا، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ یہ پہلا حکیم ہے جس نے اسطرلاب، آلات نجوم، اور رصد کا استعمال کیا، جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو اعتقاد کی انتہا نہ رہی، اسی کتاب سے سیارے اور شمس و قمر کی مقدار حرکت، دوائر، منازل، بروج، موسم کی تبدیلی، کسوف و خسوف کا وقت، طلوع و غروب کے اوقات اور سب کا حال معلوم ہوا، اس علمی انکشاف نے لوگوں کی حالت بدل دی، ایمان متزلزل ہو گئے، اور مجسطی یا اس طرح کی دوسری کتابیں جو ترجمہ ہوئی تھیں! ان کا مرتبہ کلام اللہ سے زیادہ سمجھا جانے لگا، معراج کا، اور حضرت عیسیٰ عا کے رفع الی السماء کا انکار اس دلیل سے کیا جانے لگا کہ فلکیات میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ افلاک میں خرق والتیام نہیں ہو سکتا، حاملین شریعت فقہاء و محدثین کی تضحیک ہونے لگی، آوازے کسے جانے لگے، شعراء زہد و تقویٰ کی ہنسی اوڑانے لگے، اور فساق و فجار بھی علماء ربانیین کو عقل کا دشمن اور اپنے افعال کو عقل کے موافق سمجھنے لگے۔

انہیں تراجم کا یہ اثر تھا کہ معتزلہ اور فلاسفہ اسلام کی جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے بے شمار یونانی اور غیر اسلامی تعلیمات کو اسلام کا جز بنا دیا۔

بطلیموس سے تقریباً چار سو برس پہلے فیثاغورث نے نظام شمسی کی تھیوری پیش کی تھی! لیکن فلکیات کے پُرزور دلائل نے اوس کو کالعدم کر دیا تھا، اسی لئے جب مسلمانوں نے یونانی اور مصری علوم کا ترجمہ کیا، اور علم ہیئۃ کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے، سلاطین نے رصد گاہیں بنوائیں تو کسی نے نظام شمسی کی تھیوری کو قابل توجہ بھی نہ سمجھا، فیثاغورث اور اس کے متبعین کی کتابوں کا یا تو ترجمہ نہ ہوا یا ہوا ہو تو اوس کی طرف توجہ نہ کی گئی، لیکن اب یورپ نے بطلیموس کی تغلیط کر دی ہے، اور فیثاغورث ہی کے نظام شمسی پر موجودہ علم ہیئۃ کی بنیاد رکھی ہے[۱]

[۱] فیثاغورث یا بطلیموس علم ہیئۃ کے بانی نہیں ہیں، نہ علوم عقلیہ میں سے کسی علم کی ابتداء کا زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے، فیثاغورث سے پہلے علم ہیئۃ اور دوسرے علوم عقلیہ کے بڑے بڑے (باقی صفحہ پر)

اب اس وقت حالت یہ ہے کہ یورپ یا یورپ کی زبانوں میں جہاں علم ہیئت کی تعلیم دی جاتی ہے اوس کی بنا نظام شمسی پر ہوتی ہے، اور جہاں عربی یا دوسری ایشیائی زبان میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے اوس کی بنا نظام بطلیموسی پر ہے، یا اسی سے ملتے جلتے

(بقیہ صفہ) مدارس اور بڑے بڑے علماء موجود تھے علامہ ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں کہ فیثاغورث اپنے باپ کے ساتھ ساموس آیا تو وہاں کے رئیس اندروفلوس نے اس کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا، اور اپنی کفالت میں لے لیا، کیونکہ یہ لڑکپن ہی میں آداب کی تعلیم، لغت اور موسیقی میں اپنے بھائیوں سے بہتر تھا، اس رئیس نے اس کو ہندسہ، مساحت اور نجوم کی تعلیم کے لئے شہر میلیطون کے ایک حکیم انا کیماندروس کے پاس بھیجدیا، ان علوم کے حاصل کرنے کے بعد فیثاغورث کو علم اور حکمۃ سے شدید محبت پیدا ہوگئی، اور شوق تحصیل میں اس نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا، وہ کلدانیوں کے پاس رہا، مصریوں کی خدمت کی، اور کاہنوں کی صحبت اختیار کی، مصری لغت اور مصری خطوط میں کمال پیدا کیا، جب یہ اراقلیا میں تھا تو وہاں کے حاکم سے اس کے تعلقات تھے، اور جب بابل میں تھا تو خالدیوں سے اس کے روابط تھے، زاربا طانے بڑی شفقت سے اس کو تعلیم دی تھی، اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے زیادہ تر یونانی علوم کا ترجمہ کیا، اور اسی وجہ سے یونانی حکماء کا نام زیادہ مشہور ہوا، ورنہ یونان سے پہلے روم نے اور ان سے بھی پہلے مصر نے اور مصریوں کے ترقی کے زمانہ میں سریانیوں نے اور اون کے بعد کلدانیوں نے عراق میں بڑی علمی ترقی کی تھی، اور غالباً مصریوں سے بھی پہلے جیسے ابن خلدون کا خیال ہے ایرانیوں نے ان علوم میں ترقی کی تھی، اور شاید اوسی زمانہ میں یا اوس سے بھی پہلے ہندوستان نے بڑی ترقی کی تھی، پاٹلی پتر کا ہزار ستون کا مدرسہ جس میں چین تک کے طلبا تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، اور جو دنیا کا ایک بڑا علمی مرکز تھا اوس میں بھی ہندسہ، طبعیات، فلکیات، اور الٰہیات کی تعلیم ہوتی تھی، اس لئے جن علوم و مسائل کا حکماء یونان میں سے کسی نے اولیت کا دعویٰ کیا ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا واللہ اعلم۔

نظام پر ہوتی ہی، یہ دونوں تھیوریاں ہر طرح متضاد ہیں، کواکب کے حرکات، حرکات کی مقدار، دوائر، منازل، سب میں مخالف ہیں، باوجود اس کے دونوں کے قاعدہ سے تقویم اور کسوف وخسوف کا حساب صحیح ہوجاتا ہی، اور مل جاتا ہی۔

جن لوگوں نے اس علم کو نظام شمسی کی تھیوری کے ساتھ پڑھا ہی، اون کو بالکل خبر نہیں کہ بطلیموس یا اوس کے متبعین نے فلکیات پر کیا دلائل قائم کئے ہیں، ایشیا یا یورپ میں کہیں ایک چھوٹا سا رسالہ بھی ان لوگوں کو اس موضوع پر نہیں پڑھایا جاتا، نہ اون کو ان دلایل کا سمجھانے والا کوئی ملتا ہے، اور جو لوگ بطلیموس کے فلکیات اور نظام کو پڑھتے ہیں، ان کو نظام شمسی کے دلائل سے قطعاً واقفیت نہیں ہوتی، نہ اون کے درسیات میں وہ داخل ہی، نہ اس مضمون کی کوئی کتاب اون کے پاس موجود ہی جس سے اون کو اس تھیوری کے اصلی وجوہ اور دلائل معلوم ہوسکیں، اس لئے دونوں اپنے اپنے نظام کو قطعی سمجھتے ہیں، اور دوسرے کو نہ صرف غلط بلکہ جہالت اور حماقت کا مجموعہ جانتے ہیں، کالج کے موجودہ طلبا یہ سمجھ رہے ہیں کہ دوربین کی ایجاد نے افلاک کے وجود اور بطلیموس کے نظام کو بداہتہً باطل ثابت کردیا ہے، یہ خیال اسی وجہ سے ہی کہ وہ فلکیات کے دلائل کی نوعیت سے بھی واقف نہیں ہیں، اون دلائل کی تردید دوربین سے نہیں ہوسکتی۔

علم ہیئتہ اتنی ترقی کے بعد آج بھی ایک ایسے شخص کا محتاج ہے جو دونوں تھیوریوں کے دلائل سے واقعی پوری واقفیت رکھتا ہو، اور دونوں کے درمیان محاکمہ کرسکتا ہو، اور بتا سکے کہ دونوں میں سے کوئی ایک تھیوری صحیح ہے، یا دونوں غلط ہیں، حقیقت کچھ اور ہی۔

مراتب عقل

جس طرح علوم عقلیہ کے مدارج مختلف ہیں اسی طرح خود عقل کے بھی مدارج ہیں، عقل بعض باتوں کو بالکل نہیں سمجھ سکتی، بعض باتوں کو سمجھ سکتی ہی مگر اچھی طرح یقین کے ساتھ نہیں، اور بہت سی باتوں کو سمجھتی ہے، اور پورے وثوق کے ساتھ اوس پر یقین رکھتی ہی، ہر شخص کی عقل ایک طرح کی نہیں ہوتی، ایک ہی بات کو ایک شخص بآسانی سمجھ سکتا ہی، دوسرا بمشکل سمجھتا ہے، اور تیسرا سمجھ ہی نہیں سکتا،

ایک ہی شخص کی عقل ہمیشہ ایک طرح نہیں رہتی، بڑہتی یا گھٹتی رہتی ہی، اس فرق کی وجہ سمجھنے کے لئے دو مقدمات کا ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہی۔

یہ معلوم ہوچکا ہی کہ عقل کا کام یہ ہی کہ محسوسات اور معلومات وتجربات کو ذریعہ بناکر غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرنا، اس سے دو مقدمات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) محسوسات اور تجربات کے ذریعہ جس کا علم جتنا زیادہ ہوتا جائیگا، اوس کی عقل بھی اوتنا ہی زیادہ کام کرے گی، کیوں کہ قیاس کے ذرائع اوس کو زیادہ حاصل ہوں گے۔

(۲) جن چیزوں کا یا اون کے مبادی کا علم حواس اور تجربات کے ذریعہ بالکلیہ حاصل نہ ہو، اون کا علم عقل کے ذریعہ سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ وہاں قیاس کی بنیاد ہی موجود نہیں ہی۔

اول مقدمہ کی توضیح یوں سمجھنی چاہئے کہ بچہ پیدا ہوتا ہی تو ساتھ ہی اوس کے حواس بھی کام کرنے لگتے ہیں، اور محسوسات کا ادراک بھی شروع ہوجاتا ہی، اور عقل کا مادہ بھی اوس میں اسی وقت موجود رہتا ہی، لیکن اوس کی عقل بہت کم کام کرسکتی ہی، اس لئے کہ ابھی قیاس کے مبادی اوس کے پاس جمع نہیں ہوئے، پھر جس ماحول میں وہ جوان ہوتا ہی، اور جس طرح کے مبادی اور جیسا تجربہ اوس کو زیادہ حاصل ہوتا جاتا ہی، اوس میں اوس کی عقل خوب کام کرتی ہی، حکیم کو معالجات میں، انجنیر کو تعمیر کے کام میں، وکیل کو قانون میں وہ باتیں سوجھتی ہیں جس سے دوسرے حیران رہ جاتے ہیں، لیکن اُسی عقلمند سے کسی دوسرے فن کی باتیں کرو جس کا اوس کو تجربہ نہیں ہی تو بچوں کی سی گفتگو کرے گا، اس طرح دنیا کے عاقل ترین لوگوں کے قصے بہت مشہور ہیں، اس کی وجہ یہی ہی کہ جس فن کا اون کو تجربہ نہیں ہی اور اس کے مبادی اون کو حاصل نہیں ہیں وہاں اون کی عقل کام نہیں کرسکتی، جنگل اور دیہات کے لوگوں کے سامنے برقی قوت اور اوس کے افعال وخواص کا کوئی ذکر کرے تو وہ اوس کو مسخرہ سمجھیں گے اور ان باتوں کو غلط اور خلاف عقل سمجھیں گے، اور اون کا یہ سمجھنا صحیح بھی ہوگا اس لئے کہ جس قدر ذرائع قیاس کے اون کو حاصل ہیں اون کی بنا پر یہ واقعی خلاف عقل ہوگا۔

مقدمہ ثانی اس طرح سمجھ میں آسکتا ہی کہ مثلاً کسی بڑے عاقل کے پاس کوئی مقدمہ آئے تو وہ

بلا ثبوت، بلا شواہد، بلا قرائن یا بغیر معلومات کے کوئی فیصلہ صرف عقل سے نہیں کر سکتا، اور اگر کرے گا تو وہ عقل کا فیصلہ نہ ہوگا، اور یہ کہ ہم سے پہلے دنیا میں انبیا آئے، سلاطین ہوئے، عقلا پیدا ہوئے، دنیا میں بڑے بڑے تغیرات ہوئے، بڑے بڑے واقعات کا ظہور ہوا، لیکن صرف عقل سے کسی ایک واقعہ یا حالت کو بھی ہم نہیں جان سکتے، اور اونہیں امور کے متعلق جب اخبار اور آثار کا ہمیں علم حاصل ہوتا ہے تو اون میں سے بہت باتوں کو صحیح اور بہت باتوں کو غلط جان لیتے ہیں، حالانکہ ان اخبار و آثار سے صرف درجہ حکایت کا علم ہوتا ہے، محکی عنہ کا نہیں، نفس واقعہ کے متعلق میرا فیصلہ عقل ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، مگر عقل بغیر ان ذرایع کے کچھ نہیں کر سکتی۔

اجرام فلکی کو ہم برابر دیکھتے ہیں، اون کے آثار سے منتفع ہوتے ہیں لیکن اون کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں، اور باوجود کوشش کے ابتک اون کی حقیقت دریافت کرنے میں عقل کامیاب نہیں ہوئی، کیونکہ اوس کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے وہ ابتک حاصل نہیں ہوئے۔

ہوا میں، پانی کے اندر، اور زمین کی تہ میں نہ معلوم فطرت کے کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں، اور عقل سے ہم اون کو دریافت نہیں کر سکے، صرف اس لئے کہ اوس کے کافی ذرایع حاصل نہیں ہیں، البتہ امید ہے کہ جیسے جیسے ذرایع حاصل ہوتے جائیں گے، ان خزائن مخفیہ پر انسان کا قبضہ ہوتا جائے گا،

اسی طرح ابھی اس مادیت کی دنیا میں ہزارہا چیزیں ہیں جو ہنوز عقل کے حدود سے باہر ہیں، لیکن امکان سے باہر نہیں ہیں، ابھی تک جو ذرایع حاصل ہوئے ہیں وہ نامکمل ہیں، مگر تکمیل کی امید ہے، اس لئے کہ ان سب کا تعلق مادیت سے ہے، اور مادیات کے دریافت کی طاقت انسان کو عطا ہوئی ہے، ان میں سے جن معلومات اور ذرایع معلومات کے حاصل ہونے کا امکان ہو، اوس کی کوشش کرنا انسان کا ایک فرض ہے، اسی قسم کے معلومات سے انسان اور انسانی تمدن کو یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے، اور انہیں معلومات سے انسانیت کو مزید ترقی حاصل ہوگی۔

لیکن بہت چیزیں ایسی ہیں جن کے علم کا ذریعہ یا تو باقی نہ رہا، یا جس کے دریافت کا ذریعہ

انسان کو حاصل ہی نہیں ہے، اس لئے ان چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ سے انسان کو کبھی نہیں ہو سکتا، مثلاً اس کا علم کہ یہ مادیات کی دنیا کب پیدا ہوئی، اور کیونکر پیدا ہوئی، اس علم کا ذریعہ نہ عقل کو حاصل ہے، نہ حاصل ہو سکتا ہے، نہ ازل کے شواہد موجود ہیں، نہ موجود ہو سکتے ہیں، یا مثلاً یہ کہ کب قیامت آئے گی، اور کب دنیا فنا ہو گی، عقل کچھ فیصلہ نہیں کر سکتی، یا مثلاً یہ کہ مادیت کے علاوہ اور چیزیں جن کی انبیا خبر دیتے ہیں، جیسے ملائکہ، جنّت، دوزخ وغیرہ واقعی موجود ہیں، یا نہیں یہ غیر مادی چیزیں ہیں جن کے علم کا ذریعہ عقل کو حاصل ہی نہیں ہے، ان چیزوں کو صرف عقل سے دریافت کرنے کی کوشش کرنا ذی عقل کا کام نہیں ہے۔

عقل کیا ہے؟

اون چیزوں میں سے جن کو انسان حواس یا عقل کے ذریعہ سے معلوم نہیں کر سکتا خود عقل بھی ہے، انسان چیزوں کا ادراک کرتا ہے، لیکن اب تک یہ طے نہ ہو سکا کہ کیونکر ادراک کرتا ہے، ادراک و تعقل انسان کے مادّی اجزا کا فعل ہے، یا ادراک کرنے والی چیز ان مادّی اجزا کے علاوہ کچھ اور ہے، مادّہ جس سے دنیا کی تمام مادّی چیزوں کی ترکیب ہوئی ہے، اوسی مادّہ سے انسان اور حیوانات بھی بنے ہیں، اور معلوم ہے کہ مادّہ میں ادراک و تعقل کی قوت بالکل نہیں ہے، انسان کے تمام مادّی اجزا ادراک و تعقل سے عاری ہیں، اور مادّہ کے سوا کسی اور چیز کے وجود کا ہمیں علم نہیں ہے، پھر انسان میں تعقل کا مادّہ کہاں سے آگیا، انسان اور حیوان میں لطیف ترین مادّہ روح طبی ہے، مگر معلوم ہے کہ خود روح طبّی میں بھی ادراک و تعقل کی قوت نہیں ہے۔

عقلا کی جماعت اور بالخصوص وہ جماعت جو مادّیات کے سوا اور کسی قسم کا وجود تسلیم نہیں کرتی، یہ نہ بتا سکی کہ ادراک کی قوت اور منشاء انکشاف کیا چیز ہے، اور کیونکر پیدا ہوتی ہے، بعض اصحاب عقل کہتے ہیں: العقل ھو قوۃ للنفس بھا تستعد للعلوم والادراکات ویتبعھا العلم بالضروریات عند سلامۃ الآلات

اور بعض کہتے ہیں: العقل جوھر تدرک بہ الغائبات ای النظریات

والخفیات) بالوسائط والمحسوسات۔

پہلی تعریف کی بنا پر عقل خود کوئی جوہر مستقل نہیں ہے، بلکہ نفس کی ایک قوت ہے، اور اسی قوت کے ذریعہ سے نفس ضروریات اور نظریات سب کا ادراک کرتا ہے۔

دوسری تعریف کی بنا پر عقل خود ایک جوہر ہے جس سے نفس نظریات کا ادراک بذریعہ محسوسات کے کرتا ہے۔

قابل غور یہ ہے کہ پہلی تعریف میں نفس اور دوسری تعریف میں جو جوہر کا ذکر ہوا یہ کیا ہیں، یہ مادی چیزیں ہیں یا غیر مادی۔

متکلمین نے فلاسفہ کا قول نقل کیا ہے کہ العقل مالہ مدخل فی الشعور، یا العقل ما بہ التعقل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک عقل نہ کوئی خاص جوہر ہے نہ کوئی خاص قوت ہے، وہ مشاعر عشرہ یعنی پانچ حواس جن کا ذکر ہوا، اور پانچ حواس باطنی جن کے فلاسفہ قائل ہیں، اور نفس، و نفس کی قوتیں، سب کو عقل کہتے ہیں، حتی کہ خود جناب باری پر بھی وہ عقل کا اطلاق کرتے ہیں۔

اور ابوشکور سلمی نے تمہید میں فلاسفہ کا قول لکھا ہے: العقل شئ لطیف لم یدرک کیفیتہ فی اوھامنا، ولم یثبت من الفقہاء قول صحیح فی العقل، وقالت الفلاسفۃ ان العقل جوھر، مضئ، محس، مفیل یحل فی الروح، ویثبت لہ حیوۃ کالروح فی الجسد، فللروح حیوۃ باتصال العقل کما للجسد باتصال الروح۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک عقل اور روح دونوں جسد کے علاوہ علٰحدہ جوہر ہیں، اور جسد سے پہلے موجود ہیں، روح کا جسد سے اتصال ہوتا ہے تو جسد میں حیوۃ پیدا ہوتی ہے، اسی طرح عقل جب روح سے ملتی ہے تو روح میں حیوۃ پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے نہ معلوم فلاسفہ سے ان کی مراد کیا ہے، مشائین کا مشہور مسلک یہ ہے کہ نفس کا حدوث، حدوث جسد کے بعد ہوتا ہے، اس باب میں خود حکماء مشائین کی بہت سی تصریحات موجود ہیں، فلاسفہ منشأ،

انکشاف کو عقل کہتے ہیں، مگر منشاء انکشاف کوئی متعین چیز نہیں ہے۔

بہرکیف عقل کی حقیقت میں جتنا بھی خفا ہو، اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ عقل، علم اور انکشاف کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، البتہ کلام الٰہیات میں ہے مادہ عقل کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتا، خود فلاسفہ میں سے مہندسین بھی یہی کہتے ہیں، کہ الٰہیات کا تو ہم تصور بھی نہیں کرسکتے، تصدیقات تو اس کی فرع ہے، جہاں تصور ہی ممکن نہ ہو وہاں علم اور تصدیق کے کیا معنی، فلاسفہ حواس خمسہ کے علاوہ پانچ حواس باطنی تسلیم کرتے ہیں، اور اوسی کو الٰہیات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، مگر اولاً حواس باطنی مسلّم نہیں ہیں، دوئم اگر ہوں بھی تو اون سے صرف موجودات ذہنی کا انکشاف ہوگا، موجودات خارجی کا نہیں، یا یوں کہو کہ وہ وہم ہوگا علم نہیں، جب تک بوجہ انطباق محسوسات سے نہ ہوجائے۔

الٰہیات

الٰہیات اس علم کو کہتے ہیں جس میں غیر محسوس اور غیر مادّی چیزوں سے بحث ہوتی ہے، معقولین اور فلاسفہ نے جس قدر دماغ سوزی، جانفشانی، اور غور و فکر الٰہیات میں کیا ہے، اوتنی محنت اور کسی عقلی علم میں نہیں کی، مقدمات اور دلائل میں جس طرح بال کی کھال اس علم میں کھینچی گئی ہے، دوسرے کسی علم میں وہ بات نہیں ہے، تاہم الٰہیات کا ایک مسئلہ بھی قطعی طور پر حل نہ ہوسکا۔

اس علم میں انہماک کی وجہ نہایت واضح ہے، انسان کو اور صرف انسان کو عقل کا مادہ عطا ہوا ہے، اور اسی وجہ سے انسان ہر چیز کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے، اور جس چیز کی حقیقت دریافت کرنے میں جتنی زیادہ دقت پیدا ہوتی ہے اوتنا ہی شوق تجسس زیادہ بڑھتا ہے، جب سِن تمیز میں پہونچنے کے بعد انسان کائنات عالم اور کائنات الجو پر نظر کرتا ہے تو خود بخود اوس کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کیونکر پیدا ہوئیں، کیوں پیدا ہوئیں، کس نے پیدا کیں، یہ سارا نظام کب سے اس طرح ہے، کب تک اس طرح رہیگا، انسان پیدا

ہوتا ہے، سیانا ہوتا ہے، اوس میں عقل وسمجھ ہوتی ہے، پھر کوئی اچھے اعمال کرتا ہے، کوئی بُرے
اس کے بعد مرجاتا ہے، اوس کے اعضا گل سڑ کر مٹی ہو جاتے ہیں، تو کیا اوس کی روح
بھی مرجاتی ہے، اور کیا اوس کو اپنے اعمال کا بدلہ جھیلنا پڑیگا، یا نہیں، کائنات کی جو چیزیں
ہمیں حواس اور عقل کے ذریعہ معلوم ہوسکتی ہیں، یہی کل موجودات ہیں، یا ایسی چیزوں
کا وجود بھی ہے جن کو ہم ان ذرایع سے کسی طرح نہیں جان سکتے، یہ اوسی طرح کے سوالات
ہیں جن پر غور وفکر کا نتیجہ الٰہیات کا فلسفہ ہے۔

مذکورہ بالا سوالات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی سوال کے جواب کا
صحیح ذریعہ انسانی عقل کو حاصل نہیں ہے، مثلاً پہلا سوال ہے کہ یہ کائنات کی چیزیں کیونکر پیدا
ہوئیں، اس کے حل سے پہلے یہ جاننا ضرور ہوگا۔ کہ یہ کائنات جس کو ہم موجود فی الخارج
سمجھ رہے ہیں کیا واقعی ان کا وجود ہمارے ذہن سے باہر ہے بھی یا نہیں، دویم اگر ہے تو قدیم
ہے، اور ہمیشہ سے اسی طرح ہے، یا کبھی معدوم تھیں، پھر وجود میں آئیں، سویم اگر عدم کے
بعد ان کا وجود ہوا تو خود بخود ہوا، یا کوئی عدم سے وجود میں لایا، چہارم اگر کسی نے پیدا
کیا تو وہ کون ہے، یا کون ہوسکتا ہے، ظاہر ہے کہ جب تک یہ ساری باتیں حل نہ ہوجائیں،
پہلے سوال کا صحیح جواب ناممکن ہے، لیکن ان میں سے کسی بات کے دریافت کا صحیح اور قطعی
ذریعہ انسانی عقل کو حاصل نہیں ہے۔

امر اوّل کے متعلق حکما، کہتے ہیں کہ موجودات کا انکار مکابرہ ہے، اس لئے کہ
محسوسات کے ذریعہ سے جن چیزوں کا ادراک ہمیں حاصل ہے، وہ بدیہی ہے، اور بدیہیات
سے انکار نہیں ہوسکتا، مگر سوال یہ ہے کہ خود یہ ادراک کیا چیز ہے، اور کہاں تک اسپر اعتماد
ہوسکتا ہے، ایک شخص خواب دیکھتا ہے کہ اوس نے ایک عورت سے شادی کی، اور
بارہ برس تک اوس کے ساتھ تاہل کی زندگی بسر کرتا رہا، اولاد پیدا ہوئی، اور اولاد کی طرح
اوس کے ساتھ برتاؤ کرتا رہا، مگر نیند ٹوٹی تو معلوم ہوا کہ یہ کچھ بھی نہ تھا، نہ بیوی تھی، نہ

تھے، خواب کی حالت میں اوس کے سارے حواس کام کرتے رہے، اور ساری حالتیں بالبداہتہ پیش آرہی تھیں، کبھی کسی حاسہ کی غلطی کا شبہہ بھی نہ تھا، آخر یہ سب کیا تھا، اور کیونکر یقین کیا جائے کہ یہ زندگی حقیقی ہے اور حواس اسی واقعیت سے آگاہ کر رہے ہیں، یا یہ بھی کوئی خواب ہے۔

ہم میں سے ہر شخص برابر خواب دیکھتا ہے، کانوں سے باتیں سنتا ہے آنکھوں سے دیکھتا ہے، کھانے کا مزہ، گرمی سردی کا احساس سب کچھ کرتا ہے، عالم رویا میں اوس کے سارے حواس کام کرتے ہیں، اور اوس کا یہ ادراک اوس وقت ایسا ہی بدیہی ہوتا ہے جیسے آج ہم محسوسات کو بدیہی سمجھتے ہیں، مگر کیا اون بدیہیات کی کوئی حقیقت ہوتی ہے، اگر نہیں ہوتی تو کیسے سمجھا جائے کہ جن چیزوں کا وجود آج ہم بدیہی سمجھ رہے ہیں، اون کی کوئی واقعی حقیقت ہے، سوفسطائیہ جو انہیں معقولین کی ایک جماعت ہے وہ موجودات خارجی کے وجود سے انکار کرتی ہے اور لطف یہ ہے کہ صوفیہ کی ایک جماعت جس نے الوہیت کے مسئلہ کو معقولی مسئلہ سمجھا ہے، وہ بھی ماسوا اللہ کے وجود سے انکار کرتی ہے۔

انہیں معقولین کی ایک جماعت لاادریہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ موجودات کے ہست ونیست کا ہمیں کچھ علم نہیں ہے، نہ علم کا کوئی صحیح ذریعہ ہے، ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں اوس کا ذریعہ حواس خمسہ ہے، اور نہ حواس خمسہ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، نہ خود ادراک کی حقیقت معلوم ہے، اس لئے نہ ہم محسوسات کے وجود کا اقرار کر سکتے ہیں، نہ انکار۔

انہیں میں عندیہ ہیں جو موجودات کو تخیلات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

یہ ساری جماعتیں اہل فن معقولین کی ہیں، حکما، کہتے ہیں کہ یہ لوگ بدیہیات کا انکار کرتے ہیں، اس لئے خطاب کے قابل ہی نہیں ہیں، بدیہیات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ اختلافات آج کے نہیں ہیں، یہ جماعتیں عقلاء یونان میں بلکہ اون سے بھی پہلے

موجود تھیں، ان لوگوں نے اپنی عمریں اسی غور و فکر میں صرف کر دیں، پھر ان کے شاگردوں نے اور شاگردوں کے شاگردوں نے ان مسائل پر غور و فکر کیا، اور کرتے رہے، مگر فیصلہ کا کوئی راستہ معلوم نہ ہوا، آج یورپ کے معقولین میں بھی ان سب خیال کے علماء موجود ہیں، اور کوئی بات قطعی طور پر طے نہیں کر سکتے، اس کی وجہ یہی ہے کہ عقل اس کا فیصلہ کر ہی نہیں سکتی، دو ہی صورتیں ہیں حواس پر اعتماد کیا جائے، یا یہ کہا جائے کہ دونوں صورتیں مشتبہ ہیں کوئی قطعی نہیں ہے۔

ان مشکلات کے باوجود اگر محسوسات کا وجود مستقل تسلیم کر لیا جائے تو دوسرا مرحلہ اس سے زیادہ مشکل ہے، یہ کیونکر معلوم ہو کہ یہ چیزیں قدیم اور ازلی ہیں یا حادث، اس میں خود حکماء کی جماعتیں بھی متفق نہ رہ سکیں، بعض کہتے ہیں کہ تمام مادیات میں تغیرات جاری ہیں، اور تغیرات ازلیت کے منافی ہیں، اس لئے بلاشبہ سب حادث ہیں، مگر دوسری جماعت کہتی ہے کہ تغیرات صورۃ میں ہیں مادہ میں نہیں اس لئے صورۃ حادث ہے، مادہ نہیں،

مگر ظاہر ہے کہ یہ بھی مادہ کے قدیم ہونے کی دلیل نہ ہوئی، حدوث کی دلیل کا ابطال ہوا، لہٰذا نہ یہ ثابت ہوا کہ مادہ قدیم ہے، نہ یہ ثابت ہوا کہ حادث ہے، لیکن بالفرض اگر مادہ کا قدیم ہونا بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ثبوت مشکل ہے کہ قدیم ممکن الوجود ہے یا واجب الوجود، اور صرف وجوب کی دلیل نہ ہونے سے امکان یا امکان کی دلیل نہ ہونے سے وجوب ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ عدم علم مستلزم نفی کو نہیں ہے۔

ہاں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مادہ حادث ہے، یا قدیم ممکن الوجود ہے تو اس کے وجود کے لئے ایک ایسی علت کا وجود تسلیم کرنا پڑیگا جو واجب الوجود ہو، اور یہی چیز ہے جس کی وجہ سے علماء اسلام اور دیگر اہل مذاہب نے بھی فلسفہ الٰہیات کی طرف زیادہ توجہ کی، اور اس کی اہمیت کو طبعیات اور ریاضیات سب سے بڑھا دیا، دینیات کی طرح

درس میں داخل کیا، اور اونہیں دلائل کو اصول قرار دیکر علم کلام کی بنیاد رکھی، ورنہ دراصل جس قدر علوم عقلیہ ہیں اون میں دلائل صحیحہ کے اعتبار سے کمزور ترین چیز الٰہیات کا فلسفہ ہے، الٰہیات کے مسائل کی بنیاد یا تو محض مفروضات پر ہے، یا قیاسات اور قیاسات مع الفارق پر، یعنی وہ مقدمات قائم کرتے ہیں محسوسات کے علم و تجربہ پر اور احکام صادر کرتے ہیں روحانیات پر، حالانکہ مادیات اور روحانیات ہر طرح دو مختلف چیزیں ہیں۔

حکماء الٰہیین نے مجرّدات کا وجود خارجی تسلیم کیا ہے، انہیں مجرّدات کو اصطلاح میں روحانیات کہتے ہیں، اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مجرّدات کا ادراک حواس خمسہ ظاہری سے نہیں ہوسکتا، لیکن وہ اس کے علاوہ پانچ حواس باطنی تسلیم کرتے ہیں، مگر تسلیم کرتے ہیں کہ حواس باطنی کا تعلق موجودات ذہنی سے ہے، اوس کو موجودات خارجی سے بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ عقل نے مجردات موجودہ خارج عن الذہن کو کیونکر جانا، اور علم و معلوم میں کیا چیز واسطہ بنی، عقل انسانی تو خارج میں کسی ایسے وجود کا تصور بھی نہیں کرسکتی جو مادہ اور صورۃ دونوں سے مجرد ہو، مجردات کے وجود خارجی کے ثبوت کا عقل کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

مذاہب اور انبیائے کرام

میں نے ابتک جو کچھ عرض کیا، اوس سے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ انسان کو عقل ایک ایسی نعمت عطا ہوئی ہے جس سے انسانیت کو بے انتہا ترقی ہوئی، اور اس سے انسان نے بے انتہا شرف و کمال حاصل کیا، اور ابھی علمی کمال و ترقی کے لئے اسی مادیت کی دنیا میں بڑا وسیع میدان باقی ہے، جو اسی عقل کے ذریعہ طے کیا جائے گا، لیکن یہ سب کچھ انسانی عروج و کمال کا ایک معمولی اور ابتدائی حصہ ہے، اصل شرف و کمال انسانی ایک دوسری قسم کے علم پر موقوف ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے، اور اوس کے ذرائع بھی دوسرے ہیں۔

ابتداء آفرینش عالم سے خداوند پاک نے انبیاء کرام کے ذریعہ سے انسان کی تعلیم و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری کر دیا ہے، انبیاء کرام حقائق کی وہ باتیں بتاتے ہیں جو عقل کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انبیا کی تعلیم خلاف عقل ہوتی ہے، خلاف عقل نہیں ہوتی بلکہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو وراء عقل ہیں، یعنی اون باتوں کے جاننے کا عقل کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس کے علاوہ دنیاوی زندگی کے متعلق ایسی باتوں کی بھی تعلیم دیتے ہیں جو عقل صحیح کے موافق ہوتی ہیں، لیکن انسانی عقول کے مراتب میں اختلاف ہے اس وجہ سے انسان صحیح راستہ متعین نہیں کر سکتا۔

جدید تمدن یہیں پر گمراہی میں مبتلا ہوا ہے، حکماء یورپ نے مذہب کی طرف توجہ کی تو اون کے سامنے عیسائیت تھی، اسی کو اونہوں نے نبی اور مرسل من اللہ کی تعلیم سمجھا، اور اوس میں اون کو روحانیت کی تسکین و تشفی کا کوئی سامان نہ ملا، اون کو یہ دریافت کرنا تھا کہ کیا واقعی حضرت عیسیٰ کی تعلیم یہی ہے جس کو یورپ کے عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعلیم کہتے ہیں، کیا اس کی کوئی معقول دلیل اور معتبر سند موجود ہے یا نہیں، مگر اونہوں نے یہ نہ کیا، بغیر اس تحقیق کے نہ صرف عیسائیت سے بلکہ نفس مذہب ہی سے بیزار ہو کر فلسفۂ الہیات کی طرف متوجہ ہو گئے، اور اون باتوں کو بھی جو ماوراء عقل اور ماوراء الطبیعۃ ہیں عقل ہی سے دریافت کرنا چاہا، وہاں کیا رکھا تھا، طرح طرح کے اختلافات پاپیچ در پیچ دلائل، بے تکے قیاسات، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ روحانیات کی حقیقت ہی سے بے نیاز ہو گئے، اور انتہائی علمی ترقی اور بے انتہا اقتصادی عروج کے باوجود انتہائی اخلاقی پستی میں مبتلا ہو گئے، وہ مطلق العنانی کو کمال سمجھنے لگے، اور اون کے سامنے بھلائی اور برائی کا کوئی حقیقی امتیاز باقی نہ رہا، جدید تمدن کا یہ دوسرا رخ ہے۔

انبیاء کرام کی تعلیم

انبیاء کرام فرماتے ہیں کہ موجودات صرف اتنی ہی نہیں ہیں جن کو تم حواس یا

عقل کے ذریعہ سے جان سکتے ہو، یہ تو صرف تھوڑی سی چیزیں ہیں جن کے علم کا ذریعہ تم کو دیا گیا ہے، انہوں نے بتایا کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی، کس نے پیدا کی، وہ پیدا کرنے والا کیسا ہے، اوس کے صفات، اوس کی قدرت و اختیارات کیا ہیں، انسان کیوں پیدا کیا گیا، اوس کے فرائض کیا ہیں، انبیاء کرام نے فرمایا کہ انسان نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ خدا نے اوس کو پیدا کرکے یونہی چھوڑ دیا ہے کہ جو چاہے کرے، انسان کے ہر چھوٹے بڑے، ہر اچھے اور بُرے عمل کا حساب ہوگا، اور جزاء و سزا ملے گی، جزا و سزا کے لئے جنّت و دوزخ پیدا ہو چکی ہے، خدا کے پیدا کئے ہوئے بے انتہا فرشتے ہیں جو اپنے اپنے کام انجام دیتے ہیں، اس کی لوح محفوظ ہے جس پر ما کان و ما یکون تحریر ہے، انسان مرتا ہے تو اوس کی روح فنا نہیں ہوتی، مادیت کی زندگی چند روزہ ہے لیکن روحانیت کی زندگی دائمی ہے۔

انبیاء کرام نے فرمایا کہ روحانیت کے عالم کو انسان حواس اور عقل کے ذریعہ سے جان نہیں سکتا، لیکن انہوں نے ایسے طریقے بتائے جس سے انسان کی روحانی طاقت قوی ہو جاتی ہے، اور مادیت مغلوب ہو جاتی ہے، اوس وقت انسان میں ایسا حس پیدا ہو سکتا ہے جس سے روحانیت کا علم فی الجملہ اس زندگی میں بھی انسان کو حاصل ہو جاتا ہے، اس قسم کا حس خود انبیاء کرام میں بہت قوی ہوتا ہے، وہ فرشتوں کو بالمواجہ دیکھتے ہیں، اون سے بات کرتے ہیں، معانقہ کرتے ہیں، وہ جنت و دوزخ کو دیکھ سکتے ہیں، عرش و کرسی بلکہ خود انوار ربانی کا اون پر انکشاف ہوتا ہے، وہ پیچھے سے اسی طرح دیکھ سکتے ہیں جس طرح آگے سے، وہ مدینہ کی خندق سے قیصر و کسریٰ کے محل کو دیکھ سکتے ہیں۔

غیر نبی کا روحانی احساس اتنا تو قوی نہیں ہو سکتا جتنا انبیاء کرام کا، تاہم انبیاء کرام کے بتائے ہوئے قواعد پر عمل کرنے سے ایسا حس پیدا ہو سکتا ہے جس سے انسان روحانیات کا احساس کر سکے، اور ایسے لوگوں کو علم کے دوسرے ذرایع بھی حاصل ہو جاتے ہیں مثلاً وجدان، کشف، الہام وغیرہ۔

روحانیات کی بعض چیزوں کو انبیاء کرام نے بچشم خود دیکھا، مثلاً جناب رسول اللہ نے شب معراج میں جنت، دوزخ، کوثر، صراط، عرش، کرسی، لوح، شجر، جزاء وسزا کی کیفیت خود ملاحظہ فرمائی اور اُس کی حالت وصفت بیان فرمائی، اور زیادہ چیزیں ایسی ہیں جو اون کو بھی وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں، اور وحی کے ذریعہ معلوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بلاواسطہ یا بواسطہ جبرئیل امین خود خدا نے آپ کو بتایا، اس لئے ان کے وجود میں شبہ کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہے۔

بلاشبہ انسان روحانیات سے بالکل ناواقف ہے، اور اون چیزوں کا صحیح تصوّر نہیں کرسکتا، اور انبیاء کرام نے بھی روحانیات کی چیزوں کو مادّیت کے نام سے محض تمثیلاً بتایا ہے، اس لئے کہ اوس کے حقیقی ادراک کی قوت ہم میں موجود ہی نہیں ہے، اوس کی حقیقی حالت بتا ناممکن ہی نہیں ہے، جس طرح اندھے مادرزاد کو رنگ کا فرق کسی طرح سمجھایا نہیں جاسکتا۔

تخلیق عالم کی کیفیت، توحید کا مسئلہ، روحانیات کا حال، عالم ارواح کی چیزوں کی تفصیل، عذاب قبر، حشر ونشر کی کیفیت اور مابعد الطبیعۃ کی کل یا تقریباً کل باتیں ایسی ہیں جس کو صرف انبیاء کرام ہی بتا سکتے تھے، اور اونہیں نے بتایا، ان امور کے متعلق تمام انبیاء کرام کی تعلیم جو مل سکتی ہے وہ بالکل ایک ہے، کچھ اختلاف نہیں ہے، اگر کچھ فرق ہے تو صرف اختصار وتفصیل کا، اور اختلاف ہو بھی نہیں سکتا اس لئے کہ یہ سب واقعات اور اخبار ہیں، سچے مخبروں کے بیان میں اگر اختلاف ہوگا تو طرز بیان اور ادائے مطلب میں اختلاف ہوگا، واقعات کا اختلاف نہ ہوگا۔

تمام انبیاء کرام، تمام آسمانی کتابیں، اور بالخصوص قرآن پاک نے انسان کو نظام عالم اور مظاہر قدرت پر غور وفکر کے لئے باربار متوجہ کیا ہے بلکہ تاکید کی ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، خدا کی کبریائی اوس کے کمال قدرت اور تمام صفات

کمالیہ کی مظہر ہیں، یہ کسی نے نہیں کہا کہ اس غور و فکر سے مخلوق اور خالق کی کُنہ و حقیقت یا طریق تخلیق کا صحیح حال بھی معلوم ہو سکتا ہے، انبیاء کرام تو کہتے ہیں تفکروا فی آیات اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ قرآن پاک نے فرما دیا کہ یہ کتاب اور اس کی ہدایتیں اوسی وقت تمہاری ہدایت کر سکتی ہیں جب انبیاء کرام کی بتائی ہوئی غیب کی باتیں بلا چون و چرا تسلیم کر لو، اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ اون چیزوں کی حقیقت نہ تم سمجھ سکتے ہو، نہ تم کو سمجھائی جا سکتی ہیں، اوس کا ادراک تمہاری سمجھ اور احساس سے باہر ہے، قرآن پاک کے ابتدا ہی میں ہے: ذلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب، اور غیب کے متعلق دوسری جگہ فرمایا: لا یظھر علی غیبہ احداً الا من ارتضی من رسول، اور غیب سے مراد وہی چیزیں ہیں جن کا ادراک حواس اور عقل سے نہ ہو سکے۔

ایمان بالغیب کا یہی مطلب ہے کہ انبیاء کرام نے عقائد، روحانیات اور الہیات کے متعلق جو باتیں بتائی ہیں اوس کو بلا دلیل قبول کر لیا جائے، حسّی یا عقلی دلائل کے ذریعہ نہ انبیا کی تصدیق کی جا سکتی ہے نہ تکذیب، اس لئے کہ حس اور عقل کے ذریعہ اون چیزوں کا حال کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا جن کی وہ تعلیم دیتے ہیں، اور اگر کچھ معلوم ہو سکتا ہے تو وہ بھی اسی طرح کہ انہیں کے بتائے ہوئے طریقہ سے روحانی حس پیدا کیا جائے، بلا شبہ جس کو یہ حس حاصل ہو جاتا ہے اوس کا ایمان علی وجہ البصیرۃ اور کالمعاینہ ہوتا ہے، اور وہ روحانیات سے بھی اسی طرح واقف ہو جاتا ہے جس طرح محسوسات سے۔

معجزہ

انبیاء کرام کی اون تعلیمات کی جس کا تعلق روحانیات اور غیوبات سے ہے، انسان عقلی دلائل سے نہ تصدیق کر سکتا ہے نہ تکذیب، کیونکہ وہ باتیں عقول انسانی سے بالا ہوتی ہیں، دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا اون کو مخبر صادق اور رسول برحق سمجھے، اور

اون کی باتوں کو قبول کرے، یا کاذب سمجھے، اور انکار کر دے، یعنی یا تو اون کے دعویٰ رسالت و نبوت کو قبول کرے، یا اون کے اس دعویٰ کو غلط سمجھکر انکار کر دے۔

قابل غور صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ مدعیان نبوّت کے دعویٰ کو سچ سمجھنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، کیونکر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ سچ ہے یا نہیں۔

کسی شخص کا بیان کتنا ہی مدلّل اور کتنا ہی عاقلانہ ہو، یہ اس کی نبوت کی دلیل نہیں ہو سکتی، ادعاء نبوت کا یہ مطلب ہے کہ مدعی نبوت و رسالت روح القدس کی امداد اور عالم ارواح سے تعلقات کا دعویٰ کرتا ہے، اور مدلّل و عاقلانہ باتیں کمال عقل کی دلیل ہو سکتی ہیں، روحانیت کا ثبوت اس سے نہیں ہو سکتا، اسی لئے انبیاء صادقین اور حضرات مرسلین سے وہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن کے علل و اسباب روحانی ہوتے ہیں، اون کا کوئی مادی سبب نہیں ہوتا، اور وہ باتیں خارق عادت ہوتی ہیں، انہیں باتوں کو اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔

معجزہ سے بیک وقت دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جب کوئی فعل بغیر علّت مادّی کے صادر ہوا تو ضرور ہے کہ کوئی قوت موثرہ غیر مادی موجود ہے کیونکہ معلول بغیر علّت کے نہیں ہو سکتا، دویم یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس سے ایسا فعل صادر ہوا اوس کو اوس غیر مادّی قوت مؤثرہ کی تائید حاصل ہے، اور مدعی نبوت کے لئے انہیں دو باتوں کے ثبوت کی ضرورت تھی۔

قرآن پاک نے انبیاء صادقین کے صدہا معجزات کا ذکر کیا ہے، حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا، گہوارہ میں کلام کرنا، مردہ کو دم کرکے زندہ کرنا، اکمہ اور ابرص کو صرف دم سے اچھا کرنا، مٹی کی چڑیا بنا کر دم کرنا جس سے اوس میں حیوٰۃ پیدا ہو جائے اور اڑنے لگے حضرت موسیٰؑ کا عصا، ید بیضا، خدا سے ہمکلامی، پہاڑ کا بنی اسرائیل کے سر پر معلق ہو جانا دریا کا کالطود العظیم جم کر بنی اسرائیل کو راستہ دینا، حضرت ابراہیم کے لئے آگ کا سرد اور

گلزار ہو جانا، حضرت صالح کی اونٹنی، حضرت نوح کی کشتی، اقوام کا خسف و مسخ، غیوب کی خبریں، پیشین گوئیاں، حضرت سلیمان کا تخت، ملکہ سبا کی حاضری، طیور کا کلام سمجھنے کی قدرت، چیونٹی کی گفتگو، اور اسی طرح کی صدہا باتیں ہیں جن کو قرآن پاک نے انبیاء کرام کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، اور یہ ساری باتیں اسی لئے نبوت کی دلیل ہیں کہ ان کے اسباب روحانی ہیں، مادّی نہیں ہیں، اگر مادی اسباب ہوتے اور مخفی ہوتے جس سے لوگ دھوکہ میں آگئے تو وہ شعبدہ ہوتا، نبوت کی دلیل نہ ہوتی، اگر یورپ کی قومیں بجلی کی قوتوں کو دوسروں سے مخفی رکھکر ہوائی جہاز کو اپنا معجزہ کہیں تو وہ نبی نہ ہوں گے شعبدہ باز ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ اس عالم کا نظام مادیّت پر ہے، اور یہاں جو سلسلۂ اسباب و علل جاری ہے سب مادّی ہے، اور انسان صرف مادی اسباب سے واقف ہے، اور اسی وجہ سے انبیاء کرام کے ایسے افعال کو جو روحانی ذرایع سے صادر ہوں، اون کو خارق عادت کہتے ہیں۔

لیکن بعض ناسمجھ جو یہ کہتے ہیں کہ عقل غیر مادّی علتوں کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتی وہ درحقیقت عقلیات سے بالکل نابلد اور بے بہرہ ہیں، عقلا کی جماعت میں حکماء ہیں جو مادّہ کو حادث کہتے ہیں، اور علّت محدثہ یا علت العلل کا غیر مادّی ہونا ضروری سمجھتے ہیں، فلاسفہ کی دوسری جماعتیں ہیں جو مادّہ کو قدیم کہتی ہیں، اور قدیم ممکن الوجود، وہ بھی علّت مرجحہ کو واجب الوجود تسلیم کرتی ہیں جس کو وہ غیر مادی کہتے ہیں، ان کے علاوہ اگرچہ معقولین و فلاسفہ کے اقوال و اختلافات بہت ہیں مگر جہانتک علم ہے شاید کسی نے یہ دعوی نہیں کیا کہ غیر مادّی موجودات کی نفی پر کوئی عقلی دلیل قائم ہوگئی ہے۔

مہندسین اور بعض طبعیین یہ کہتے ہیں کہ غیر مادّی موجودات کے نفی یا اثبات پر کوئی دلیل عقلی نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسا وجود ہمارے ادراک و تصور سے باہر ہے، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اس کی نفی پر کوئی دلیل قائم ہوگئی ہے تو پھر انبیاء کرام کے دعوی سے انکار کی

کونسی عقلی وجہ موجود ہی، اور کس کی عقل غیر مادی علتوں کا وجود تسلیم نہیں کرتی۔

کرامت و استدراج

معجزہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہی کہ جب کرامت و استدراج کی وجہ سے غیر انبیاء سے بھی خارق عادت باتیں صادر ہو سکتی ہیں تو معجزہ سے نبوت پر استدلال مشتبہ ہو جاتا ہے، کیونکہ استدلال خارق عادت ہی ہونے کی بنا پر تھا، یہ شبہ بالکل لغو ہی، بلاشبہ کرامت اور استدراج دونوں میں روحانی ترقی کی وجہ سے خارق عادت باتوں کا ظہور ہوتا ہی، مگر جس کی روحانی طاقت اس درجہ ترقی کر جائے گی کہ اوس کی روحانیت عالم مادی پر اثر ڈال سکے اوس سے صدور کذب نہیں ہو سکتا، کذب روحانیت کے منافی ہے، اگر وہ نبوت کا جھوٹا دعوی کریگا تو اوس کی روحانی طاقت سلب ہو جائے گی، اور جب تک روحانی طاقت رہے گی جھوٹ نہ بولیگا، اسی لئے دعوی نبوت کے ساتھ خارق عادت باتیں صرف نبی صادق سے ظاہر ہو سکتی ہیں، اور کسی سے نہیں۔

شعبدہ

شعبدہ کو معجزہ و کرامت سے کوئی نسبت نہیں ہی، شعبدہ میں کوئی بات خارق عادت ہوتی ہی نہیں، شعبدہ باز جو کچھ کرتا ہی، اس کی علت معمولی مادی باتیں ہوتی ہیں، مگر یا تو دھوکہ دینے کے لئے چالاکی سے اون اسباب کو ظاہر ہی نہیں ہونے دیتا، یا خود اسباب ایسے مشکل و مخفی ہوتے ہیں جن کو دوسرے سمجھ نہیں سکتے، اوس کو روحانیت سے کچھ واسطہ نہیں، بلکہ روحانیت کے منافی ہی۔

لوح محفوظ

میں نے عرض کیا ہی کہ روحانیت کی چیزیں ایسی ہیں جن کو نہ ہم سمجھ سکتے ہیں، نہ انبیاء ہمیں اون کی حقیقت سمجھا سکتے ہیں، کیونکہ اوس کے سمجھنے کی استعداد ہی ہم میں نہیں ہی، باوجود اس کے بعض اہل علم بھی ایسے طفلانہ شبہات پیش کرتے ہیں جو ادنی

تامل سے رفع ہو سکتے ہیں، مگر سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، مثلاً اعتراض کیا جاتا ہے
کہ لوح محفوظ کتنا بڑا ہے جس پر ما کان و ما یکون ازازل تا ابد تحریر ہے، کس روشنائی سے تحریر
ہے، اور کس زبان میں لکھا گیا ہے، کون سے حروف اور کیسے خط میں ہے، ان عقلا سے
دریافت کیا جائے کہ ایک شخص سو برس زندہ رہتا ہے، بہت سے ملکوں کی سیر کرتا
ہے، بہت سے علوم و فنون اور بے شمار تجربات حاصل کرتا ہے، اور سارے معلومات اوس
کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں، یہ کیسے محفوظ رہتے ہیں، بڑی کوشش کے بعد فلاسفہ نے
یہ بتایا کہ ذہن میں صورتیں چھپ جاتی ہیں جس طرح آئینہ میں، اگر یہ صحیح ہے تو صورتیں زیادہ
سے زیادہ مبصرات کی چھپ سکتی ہیں، ہمیں طیور کی آواز کا اختلاف، درندوں کی آواز،
چوپایوں کی آواز، اور اون کا فرق، مرد و عورت کی آوازوں کا امتیاز، بلکہ ہر انسان
کی جداگانہ آواز کا علم ہے، اور اون کا فرق معلوم ہے، ان آوازوں کی شکلیں کیسی ہوتی ہیں
جو ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں، خوشبو، بدبو، گرمی، سردی، نرمی، سختی سب کا علم
ہمکو ہے، اور سب کا فرق ہم جانتے ہیں، مگر ان کی شکلوں کا علم نہیں ہے، آخر یہ چیزیں کیونکر
محفوظ ہیں، پھر مبصرات کی شکلیں بھی کہاں چھپتی ہیں، اور کیونکر محفوظ رہتی ہیں، کسی
بڑے سے بڑے فلسفی کا دماغ چیر کر دیکھو اوس میں ایک شکل بھی چھپی ہوئی نہ ملے گی،
جب ہمیں خود اپنے دماغ اور اپنے معلومات کا حال نہیں معلوم ہے تو لوح محفوظ کا حال نہ معلوم
ہونا کون سے تعجب کی بات ہے، لوح محفوظ بچوں کی تختی کا نام نہیں ہے، ذہن اور حافظہ
سے قوی تر روحانی طاقت کا نام ہے۔

مذہب کی اصل بنا

مذہب کی بنا جن وجوہات پر ہے وہ حسب ذیل ہیں: انبیاء کرام اور مرسلین
عظام فرماتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا، یہاں جو اچھے یا بُرے اعمال
انسان سے سرزد ہوتے ہیں وہ رایگاں نہیں جاتے، انسان اور یہ سارا نظام عالم

جس کو ہم محسوس کر رہے ہیں خود بخود پیدا نہیں ہوئے، سب کا خالق مالک خداوند ذوالجلال
والاکرام ہے، اوس نے صرف اسی عالم کو پیدا نہیں کیا، اوس کا پیدا کیا ہوا عالم غیر
محسوس اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہے جس کی بڑائی اور وسعت کی انتہا نہیں ہے، انسان
کو اوس نے صرف اس لئے نہیں پیدا کیا کہ اپنے خالق کی عطا کردہ تمام طاقتوں کو صرف
کرکے کچھ دنیا کا مال و متاع جمع کرے، عیش و عشرت کرے، دوسروں کو ستائے، اور
مرے تو اپنی ساری زندگی کے حاصل کردہ متاع کو بے اختیار یہیں چھوڑ کر حسرت کرتا ہوا
خالی ہاتھ دوسرے عالم میں چلا جائے، انہوں نے بتایا کہ مرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان
ایک عالم سے دوسرے عالم میں جاتا ہے، عالم محسوسات سے عالم روحانیات کی طرف
انتقال کرتا ہے، اور اس زندگی کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ اوس کو اوس عالم میں
ملتا ہے، یہ دار العمل ہے، اور وہ دار الجزا ہے، اوس عالم کی زندگی ویسی ہی ہوگی جیسے
اس عالم کے اعمال ہوں گے، یعنی اس دار العمل میں جس کی روحانیت ترقی کر گئی ہے
اوس کا درجہ وہاں بلند ہوگا، اور جس کی روحانی طاقت مادیات میں پھنس جانے کی
وجہ سے پست ہو گئی ہے، اوس کو علی قدر مراتب وہاں ذلت و رسوائی نصیب ہوگی

انبیاء کرام نے کسی شخص کو علوم و فنون کی ترقی اور صنعت و حرفت میں کمال
حاصل کرنے سے روکا نہیں، بلکہ فرمایا کہ حکمت کی باتیں جہاں ملیں لے لو، علوم اور انسانیت
کی ترقی کے لئے خدا نے عقل عنایت کی ہے، اور عقل کی ہدایت کے موافق کام کرنا عین
منشاء خداوندی ہے، انبیاء علیہم السلام کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرو مگر مقصود اصلی کو بھول
نہ جاؤ، مقصود اصلی یہ ہے کہ تم کو ہمیشہ اس دنیا میں رہنا نہیں ہے، چند ہی دنوں کے
بعد یقیناً مرجانا ہے، اور مر کر دوسرے عالم میں جانا ہے، تمہاری اس زندگی کا مقصود اصلی
اوس دوسری دائمی زندگی کو خوشگوار بنانا ہے،

ادنیٰ تامل سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ عقل سلیم جس طرح یہ چاہتی ہے کہ ہماری

یہ زندگی خوشگوار ہو، اُسی طرح یہ بھی چاہتی ہی کہ مرنے کے بعد والی زندگی اس سے زیادہ
بہتر اور مکمل ہو، اس زندگی کی ترقی و اصلاح کا بہت سا قاعدہ تجربات کے بعد خود
عقول انسانی مرتب کر سکتے ہیں، لیکن دوسری زندگی چونکہ عقل و حواس سے بالاہی،
نہ وہاں کی حالت عقل کو معلوم ہی، نہ وہاں کا کچھ تجربہ حاصل ہو سکتا ہی، اس وجہ سے
کسی رہبر اور واقف معلم کی ضرورت ہی، وہی رہبر اور وہی معلم انبیاء کرام اور مرسلین
عظام ہیں، اونہیں کی تعلیم و ہدایت کا نام مذہب ہی۔

خود انبیاء کرام کی تعلیم روحانیت کے ذریعہ سے ہوتی ہی، اور اون کو ساری ہدایتیں
اوس عالم سے ملتی ہیں، اس لئے صرف وہی بتا سکتے ہیں کہ اوس عالم کے لئے کون
کام مفید ہی، اور کون کام مضر، اور اونہیں کی تعلیم صحیح مذہب اور صحیح ہدایت ہو سکتی
ہے، اور سب کو اوسی کی اتباع لازم تھی مگر انسان نے اس پر صبر نہیں کیا، بہت
سے عقلا نے اس عالم آب و گل کے قیاس پر وہاں کا بھی ایک قیاسی نقشہ طیار کر لیا
اور اوس زندگی کو خوشگوار بنانے کے خیال سے خود اپنی اپنی سمجھ کے موافق مختلف
اعمال اور مختلف قوانین بنا لئے، اس طرح انبیاء کرام کی تعلیم کے علاوہ عقلی اور فلسفی
مذاہب بے شمار اور متضاد دنیا میں پھیل گئے جن کی بنا کسی نبی کی تعلیم پر نہیں ہی، نہ حقیقی
معنی میں اوس کو مذہب کہہ سکتے ہیں، حقیقی مذہب وہی ہی جس کو خدا کے رسولوں
نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اختلاف مذاہب

مذہبی تعلیمات کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا، یہ انبیاء کرام کی تعلیمات کا اہم حصہ
ہے، اوس کو اصطلاح میں عقاید کہتے ہیں، مذاہب کی بنیاد اونہیں تعلیمات پر ہوتی ہی،
اس میں خداوند پاک کی خالقیت، ربوبیت، اور اس کی قدرت و جلال اور تمام صفات
کمالیہ کا حال، وحی کے طریقے، ارسال رسل، ملائکہ کا وجود، کتب سماوی، بعث بعد

الموت، حشر و نشر، اور طریق جزا و سزا کا حال شامل ہے، ان امور میں تمام انبیاء کرام کی تعلیم ایک اور متفق علیہ ہے، بالکل اختلاف نہیں ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اون تعلیمات میں تحریف اور رد و بدل نہ ہوا ہو۔

لیکن معقولین اور فلاسفروں نے موجودات روحانی، حیات روح، اور جزا و سزا وغیرہ کے متعلق انبیاء کرام کی تعلیم کے خلاف دوسری تھیوریاں قایم کر لی ہیں، جیسے تناسخ وغیرہ کے مسائل ہیں، اس قسم کی تھیوریوں سے بہت سے مختلف مذاہب پیدا ہو گئے، اور وہی بہت سی اقوام و ممالک میں مذہب کی طرح معتقد علیہ بنے ہوئے ہیں، حالانکہ اس کی سند بالکل موجود نہیں ہے کہ کسی نبی مرسل من اللہ نے کبھی اس طرح کی تعلیم دی، یا اوس کو حق کہا، اس کے علاوہ ان کی تھیوریاں آپس میں بھی ایک دوسرے کے خلاف اور متضاد ہیں۔

ان معقولین نے در اصل خلط مبحث کر دیا ہے، انبیاء کرام کے اس بیان کو تو تسلیم کر لیا ہے کہ تمام عالم مادی و غیر مادی کا خالق خداوند ذوالجلال ہے، اور یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ انسان کے اچھے اور برے اعمال کے لئے جزا و سزا ہے، لیکن صفات باری تعالیٰ، اور جزا و سزا کی کیفیت کے متعلق اپنے اپنے قیاسات و مفروضات و تخیلات کی بنا پر نئی نئی تھیوریاں تجویز کر لیں۔ حالانکہ اون کو روحانیات کا کوئی علم اور ان سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

دونوں قسم کے مذاہب دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، انبیاء اپنی تعلیمات پر عقلی یا فلسفی دلائل نہیں دیتے، وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے خدا نے اس طرح ہم پر وحی کی ہے، ہم وہی جانتے ہیں جو وحی کے ذریعہ ہمیں بتایا گیا ہے، مگر عقلی مذاہب وحی سے واقف ہی نہیں ہیں، وہ مادی دلائل ہی سے اپنی روحانیات کی تھیوری بھی ثابت کرتے ہیں، حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جو ماوراء عقل اور ماوراء الطبیعۃ ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام عقلی مذاہب تو قطعاً باطل ہیں، اگر انبیاء کرام صادق ہیں تو ان کی ساری تعلیمات کو بعینہ قبول کرنا ہوگا، اور عرض کر چکا ہوں کہ انبیاء کرام نے فلسفی یا عقلی دلائل سے نہیں بلکہ ہزار ہا معجزات سے روحانیات کا وجود اور اپنا مرسل من اللہ ہونا عیاناً ثابت کر دیا ہے، اور عقل سلیم کو ان کی اتباع کے سوا چارہ نہیں ہے، عرض کر چکا ہوں کہ انبیاء کی تعلیم عقاید میں مختلف نہیں ہو سکتی، اور اختلافات جو پائے جاتے ہیں، اون کی وجہ یہ ہے کہ اصل تعلیم میں تحریف کر دی گئی ہے، انبیاء صادقین کی طرف اگر وہی باتیں منسوب کی جاتیں جن کا کافی ثبوت موجود ہوتا تو یہ اختلاف باقی نہ رہتا، طریق عبادت اور معاملات کا اختلاف چنداں اہم نہیں ہے۔

احکام و عبادات

رسولوں کی تعلیم میں دوسری چیز احکام الٰہی ہے، جس کے لئے وہ رسول بنا کر دنیا میں بھیجے گئے، یہ احکام دو قسم کے ہیں، ایک قسم میں وہ اعمال داخل ہیں جن سے مقصود اظہار و اقرار عبدیت ہے، اور وہ ایسے اعمال ہیں جن سے روحانی ترقی اور دوسرے عالم سے اتصال کی استعداد پیدا ہوتی ہے، ان کو اصطلاح میں عبادات کہتے ہیں، عبادات کے اصول و قواعد بھی انسانی عقل صحیح طریقہ سے مرتب نہیں کر سکتی، انسان جب صرف عقل سے صفات باری تعالیٰ کو نہیں جان سکتا، تو یہ کیونکر جان سکتا ہے کہ وہ اظہار عبدیت کے کس طریقہ کو پسند کرتا ہے، جب انسان روحانیت ہی کو نہیں جان سکتا تو یہ کیونکر جان سکتا ہے کہ روحانی ترقی کیونکر ہوتی ہے، اور اوس کے ذرایع کیا ہیں، جس طرح عقاید کی تعلیم صرف انبیاء و مرسلین دے سکتے ہیں اوسی طرح عبادات مرضیہ کی تعلیم بھی صرف وہی دے سکتے ہیں، البتہ عقاید چونکہ روحانیات، غیوبات اور اصول خداوندی کے اخبارات ہوتے ہیں، اون میں تمام انبیاء کرام کا بیان متفق علیہ ہے، اون میں اختلاف نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے مصدق ہیں، مکذب نہیں ہیں، لیکن عبادات

کا حال ایسا نہیں ہے، اظہار عبودیت کا قاعدہ، خدا تک پہونچنے کا راستہ، روحانی ترقی کے ذرایع ایک ہی نہیں ہیں، بہت ہیں، اس لئے ان میں انبیاء کرام کے طریقے مختلف ہیں، اور سب صحیح ہیں، مختلف زمانہ میں اون کی اور اون کی امت کی استعداد کے موافق خود خداوند کریم نے اون کو مختلف حکم دئے، وہ سب طریقے خداوند کریم کے پسندیدہ ہیں بشرطیکہ صحیح وقت پر اور انبیاء کی تعلیم کے موافق ان پر عمل کیا گیا ہو۔

عقلی اور فلسفی مذاہب کے بانیوں نے بھی عبادات کے طریقے اپنی رائے اور قیاس سے بنائے ہیں، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ معبود حقیقی ان طریقوں کو پسند بھی کرتا ہے یا نہیں، ان لوگوں نے ایسی ایسی عبادتیں ایجاد کی ہیں جن میں بڑی بڑی محنت شاقہ اور نفس کشی وریاضت ہے، مگر وہ انبیاء کرام کے بتائے ہوئے طریقوں کے خلاف ہے اس لئے اوس کو صحیح مذہبی عبادت نہیں کہہ سکتے۔

معاملات

میری ان گذارشات سے واضح ہوگیا کہ مذہبی تعلیمات کی دو قسمیں عقاید اور عبادات عقلی حدود سے باہر ہیں، ان چیزوں کا علم صادق رسولوں کے ذریعہ سے ہوا ہے، ان پر دلائل عقلی طلب کرنا، یا ان تعلیمات کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسا ایک پیدائشی اندھا ماہتاب اور ستاروں کے وجود سے انکار کرے، یا الوان کے مختلف اقسام سفید، سرخ، سبز، سیاہ وغیرہ کے فرق کو تسلیم نہ کرے، اور اس پر عقلی دلیل طلب کرے۔
البتہ مذہبی تعلیم کی تیسری قسم معاملات کے مسائل ایسے ہیں جن کی خوبی یا برائی اور اوس کے اچھے یا بُرے نتائج عقل یا تجربے کے ذریعہ سے بھی معلوم ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ معاملات کے مسائل عقول انسانی کے دائرہ میں داخل ہیں، اور انہیں مسائل سے مذہبی تعلیم اور موجودہ تمدن کو عقلی معیار پر جانچا جا سکتا ہے۔

اسلام نے معاملات کے متعلق بڑی وسیع اور مکمل تعلیم پیش کی ہے، اور اون پر مکمل

بحث اسس طرح ہوسکتی ہے کہ معاملات کے تمام ابواب کا علحدہ علحدہ تمدنی قوانین سے مقابلہ کیا جائے، متقدمین میں امام غزالی نے اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اس پر مبسوط بحثیں لکھی ہیں، اور دوسرے علماء نے بھی متفرق طور پر عقل و مذہب کی تطبیق پر بہت کچھ لکھا ہے، جس سے سمجھدار شخص بہت کچھ اطمینان حاصل کرسکتا ہے۔

میں اسس وقت معاملات کے بعض ہمہ گیر مسائل کے متعلق کچھ عرض کرونگا جس سے معلوم ہوگا کہ اسلامی تعلیم کا عقلی معیار کتنا بلند ہے، اور عقول انسانی کی رسائی ابتک کس حد تک ہوسکی ہے، اسس سے یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ انسان اور انسانیت کی ترقی، دنیا کا امن، علوم و صنایع کا کمال مذہبی تعلیم کے ساتھ زیادہ ہوسکتا ہے، یا موجودہ تمدن کے ساتھ۔

نظام حکومت

جب انسان نے اجتماعی زندگی شروع کی، اوسی وقت سے کسی نہ کسی پیمانہ پر نظام حکومت اور قانون سازی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، اور ہر زمانہ میں بہترین انسانی عقول اور انسانی قوتیں نظم حکومت اور قانون کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے میں صرف ہوتی رہیں، حکومت کے ہزارہا نظام اور قوانین کے صدہا اصول بنائے گئے، لیکن مقصود اصلی کے لئے کوئی مکمل نظام مرتب نہ ہوسکا، اصل مقصود یہ تھا کہ اجتماعی زندگی میں انسان کی اجتماعی طاقت انسان کی ترقی میں صرف ہوسکے، اسس مقصد کے حصول کے لئے دو باتیں نہایت ضروری تھیں، امن اور حقوق کی صحیح تقسیم، اور انھیں دو باتوں کے لئے بظاہر قانون سازی کی ابتدا ہوئی۔

مقصد اصلی تو یہ تھا، مگر ہوا یہ کہ ایام قبل تاریخ و بعد تاریخ زمانہ جاہلیت میں انسان کی اجتماعی طاقت بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی، اور انسانی نسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، وطن اور خاندان و نسل کی بنا پر بہت سی جدا جدا

قومیں بن گئیں، اور ساری قومیں اپنے اپنے تفوق اور برتری کا دعوی کرنے لگیں، حقوق کو صحیح طور پر سمجھنے کی بجائے قومیت کے معیار پر استحقاق کو دیکھا جانے لگا، اور عصبیت قومی بہترین قابل تعریف شے سمجھی جانے لگی، حق و باطل کا امتیاز قومی تعصبات کے اندر فنا ہو کر رہ گیا۔

زمانہ وسطیٰ میں نظام حکومت اور قانون سازی کے بے شمار طریقوں کا تجربہ ہوا، شخصی سلطنتیں ہوئیں، مخلوط حکومتیں بنیں، جمہوری نظام قائم ہوا، طرح طرح کے قوانین بنائے گئے، بے حد و حساب اصلاحات ہوتی رہیں، لیکن زمانہ جاہلیت کی قائم شدہ قومی تفریق نے سب کو مٹا دیا، اور ہمیشہ اس تفریق نے دنیا کو فتنہ و فساد میں مبتلا رکھا، اور قوم کی قوم، ملک کا ملک انسانی نسل کی اسی قومی تفریق کی وجہ سے فنا ہو گیا۔

اس وقت جس کو انسانی ترقی کا بہت روشن زمانہ سمجھا جاتا ہے، علوم و صنایع کمال تک پہونچے ہوئے ہیں، اسی جاہلیت کی قومی تفریق نے سب سے زیادہ آفت مچا رکھی ہے، یورپ اس وقت ترقی یافتہ اور سمجھدار ملک ہے، وہاں ہر طرف جمہوری حکومتیں قائم ہیں، لیکن جمہوریت کی بنیاد بھی اسی قومی تفریق پر رکھی گئی ہے، اس وقت قومیت کے معنی وطنیت ہے یعنی ایک وطن اور ایک ملک کے باشندے اپنی فلاح و بہبودی کے لئے، اپنی قومی و ملکی برتری کے لئے جس طرح چاہیں قانون بنائیں، کوئی قوت اون کو اس سے روک نہیں سکتی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کی ساری قومیں ایک دوسرے کی دشمن ہو رہی ہیں، اور علوم و فنون، سائنس و فلسفہ، صنعت و حرفت جو انسانی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، وہاں بڑے سے بڑے پیمانہ پر انسان کو تباہ و فنا کرنے کے لئے مہیا کیا جا رہا ہے، شخصی حکومتوں کے زمانہ میں، اشخاص ایک دوسرے کو ستاتے تھے، قوی ضعیف پر ظلم کرتا تھا، دولت مند غریب پر مصیبتیں نازل کرتا تھا، اب جمہوریت

کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے لڑتی ہے، طاقتور قوم ضعیف قوم کو برباد
وتباہ کرتی ہے، دولتمند قوم غریب قوم کو لوٹتی بلکہ فنا کرتی ہے، لیکن بہرصورت مشترک
علت جس سے یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں، وہی قومی تفریق، وہی جاہلیت کا قومی
تعصب، وہی آبائی رسم کی قومیت ہے، جمہوریت اور اعلیٰ قانون سازی کے دعودلا
نے اس کو مٹایا نہیں اور بڑھا دیا، اس ناجائز قومیت کے ساتھ جب تک شخصیت تھی
دنیا کے لئے وہ عام خطرہ نہ تھا جو آج جمہوریت و قومیت کے جمع ہو جانے سے نظر آرہا ہے۔

یورپ کے عقلا اور سیاسیئین اس وطنیت کے بڑھتے ہوئے فتنوں سے
ناواقف نہیں ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے لئے یہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے، اور
یہی چیز یورپ کو تباہ کر کے رہے گی، یورپ نے صرف اس کا ایک علاج سوچا تھا،
انٹرنیشنل کانگریس لیکن انٹرنیشنل قوانین کی دھجیاں بکھر چکیں، وہ بے دست وپا ہو کر
رہ گیا، جہاں کا ہر شخص نیشنلٹی میں فنا ہو چکا ہو وہاں انٹرنیشنل قانون کا مخلص حامی کہاں
سے آوے، نیشنل قوانین کی حمایت میں ساری قومیں علٰحدہ علٰحدہ بٹ چکیں، انٹرنیشنل
قوم کہاں سے پیدا کی جائے۔

انسان اور انسانی نسل کو وطن یا خاص خاص نسلوں کی بنا پر بے شمار قوموں میں
تقسیم کر دینا دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے جو جڑ پکڑ گئی ہے، ابتدا میں جب انسان نے
اجتماعی زندگی شروع کی تھی اوس وقت حفاظت کے لئے اس کی ضرورت ہوگی،
مگر آج قومیت کے اوس ابتدائی اور جہالت کے معیار کو قائم رکھنا انسانی زندگی کے
لئے مصیبت عظمیٰ ہے، یہ تقسیم ہمیشہ عالم کے امن وامان کو تباہ کرتی رہی ہے، اور کرتی
رہے گی، قومیت کا یہ معیار قائم رہا تو حکومت کے قاعدہ میں جس قسم کی تبدیلی بھی کی جائے
اوس سے دنیا کا امن بحال نہیں ہو سکتا، حکومت شخصی ہو یا جمہوری، نازی ہو یا
فاسسٹ، سوشلسٹ ہو یا کمیونسٹ، جب تک اُس کے ساتھ قومیت اور قومی

عصبیت باقی رہے گی، دوسری قوموں کے لئے وہ آفت رہے گی، اصل ضرورت یہ ہے کہ قومیت کے وطنی معیار کو مٹادیا جائے، اور اس تفریق کے مٹانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان ایک اخوت کی بندش میں شامل ہوجائیں۔

اس مصیبت کا علاج صرف اسلامی تعلیم کے اتباع سے ہوسکتا ہے، اس کے سوا اور کوئی ممکن العمل صورت موجود نہیں ہے، اسلام نے بڑی سختی سے عصبیت قومی اور نخوت جاہلیت کو روکا، اور حضور صلعم نے فتح مکہ کے روز اس قومی تفریق اور نسبی تفاخر کو اپنے پیروں سے روند کر مٹادیا، عرب و عجم کو ایک اخوت کے رشتہ میں منسلک کردیا، اور فرمایا: کونوا عباد الله اخوانا، اور فرمایا: المومنون کرجل واحد ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایک ایسی متحدہ قوم پیدا ہوئی جس میں ہزارہا قومیں مدغم ہوکر ایک بڑی قوم بن گئی، جس کا نام آج مسلم قوم ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کو دیکھو تو اس میں صدہا بلکہ ہزارہا ایسی قومیں ملیں گی جن کو ایک دوسرے سے مطلقاً کوئی نسبت نہ تھی، ترکی، تاتاری، شامی، عربی، مصری، عراقی، ایرانی، افغانی، حبشی، مغربی، مغل، ہندی، سندھی، چینی اور اقطاع عالم کی بے شمار قومیں ایک رنگ میں رنگ گئیں، عقائد و عبادات ہی میں نہیں، معاشرت اور معاملات کے مسائل میں بھی ایک ہوگئے، کھانا، پینا، حلت و حرمت کا مسئلہ، ذبیحہ کا طریقہ، شادی بیاہ، موت و غم، ساری باتوں میں یک رنگی اور یک جہتی پیدا ہوگئی۔

اسلام نے متحدہ قومیت کو اصول قرار دیکر نظام حکومت کے بہت سے ارکان لازمی قرار دئے تھے، اون میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ایک وقت میں مسلمانوں کی مستقل دو حکومتیں نہیں ہوسکتیں، مسلمان کسی ملک، کسی قوم و نسل، اور کسی مرتبہ کے ہوں، ان پر فرض ہے کہ سب مل کر ایک کو خلیفہ بنائیں، اور اوس کی بیعت کریں، دوسرا کوئی خلافت کا دعوی کرے تو اوس کی گردن ماریں ابوداؤد کی روایت ہے: من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ، اور

صحیح مسلم کی روایت ہے: اذا بویع للخلیفتین فاضربوا عنق الآخر
اسلام نے اس طرح عصبیت قومی کا خاتمہ کرکے فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ دی تھی، مسلمان اگر اسلام کی اس تعلیم پر مستحکم رہتے تو مسلمانوں کی اندرونی تاریخ آج بالکل دوسری ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ اسلام کی اس اہم اور صریح تعلیم کے موجود رہتے ہوئے بھی قومیت کے جاہلانہ تفاخر کو پوری طرح مسلمان ترک نہ کر سکے، مسلمانوں کی اندرونی خوں ریزیوں کی تاریخ ایک ایک کرکے پڑھ جاؤ، معلوم ہو جائیگا کہ ان سب کی اصل وجہ یہی قومی عصبیت اور جاہلانہ قومی تفاخر ہے۔

جمہوریت قانون سازی کا کامل اختیار ہر قوم کو علیحدہ علیحدہ دیدیتی ہے، اور ہر قوم صرف اپنے فوائد کو پیش نظر رکھکر قانون بناتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جمہوریت دوسری سے ٹکراجاتی ہے، اسلام نے یہ نہیں کیا، کسی قوم کو قانون سازی کا کامل اختیار نہیں دیا، بلکہ بلالحاظ کسی قومی خصوصیت کے تمام اہم اور مشترک امور کے لئے قانون یا اصول قانون خود مرتب کر دیا، البتہ ملکی خصوصیات اور وقتی ضروریات کے ضمنی قانون یا جزوی مسائل کے استنباط کا حق ہر ملک کے مجتہدین اور اہل حل و عقد کو عطا کیا، اور خود رسول اللہ صلعم نے اچھے پیمانہ پر حکمرانی کرکے ایک نظیر سامنے رکھدی، اس لئے اسلامی دائرہ میں رہکر قومی ٹکر کا راستہ مسدود ہو گیا۔

خلفاء راشدین کے بعد مسلمانوں میں بھی اکثر جہالت کا پرانا قومی جذبہ بھڑک اٹھتا تھا اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی اندرونی تاریخ بھی آپس کی جنگوں سے خالی نہیں ہے، تاہم جن قوموں نے اسلام قبول کیا، اون میں وہ مغایرت باقی نہ رہی جو اسلام کے قبل تھی، یا جو اب بھی اون لوگوں میں موجود ہے جو اوسی قوم کے لوگ ہیں مگر مسلمان نہ ہوئے۔

مسلمانوں میں مذہبی اختلافات بہت ہیں، مگر ان اختلافات سے مغایرت پیدا نہیں ہوتی، دنیا میں کوئی ایک قوم ایسی موجود نہیں ہے جس کے اندر اس قسم کے اختلافات

موجود نہ ہوں، ایسے اختلافات مٹ نہیں سکتے، یہ اختلافات علم، فہم اور ادراک و ذکاوت کے فرق کی وجہ سے ہیں جس طرح دو آدمی شکل و صورت میں بجمیع الوجوہ یکساں نہیں ہیں، اسی طرح فہم و ذکاوت میں بھی یکساں نہیں ہیں، لہذا فرق مراتب کی وجہ سے ایک ہی چیز کا مطلب سمجھنے میں اختلاف کرتے ہیں، ایسا اختلاف ایک نسل، ایک ملک، ایک خاندان، اور ایک گھر کے افراد میں بھی ہوتا ہے، اس سے مغایرت نہیں پیدا ہونی چاہیئے، ایسا اختلاف اگر ضد اور جہالت کی وجہ سے ہو تو برا ہے، اور علمی وجوہ کی بنا پر ہو تو باعث رحمت ہے۔

اقتصادیات

دنیا کا دوسرا اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا انتظام ہے، ہر ملک کی انسانی آبادی کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی کم سے کم ضروریات زندگی بھی مہیا نہیں کرسکتا، بیوہ، یتیم، نابینا، معذور، مجبور، فقرا، مساکین وغیرہ سے کوئی ملک خالی نہیں ہے، حکومت اور سلطنت کو ایسے لوگوں کی کفالت کا ذمہ دار ہونا چاہیئے، ہر ملک میں مستقل انتظام ہونا چاہیئے کہ اس قسم کا کوئی انسان بھوکا نہ رہ جائے، مگر جہانتک دنیا کی تاریخ اور حکومتوں کے قوانین کا حال معلوم ہے، کسی سلطنت نے کبھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کیا، قوانین ملک میں کبھی ایسے لوگوں کو کوئی مستقل جگہ نہ دی گئی، آج ساری جمہوری اور شخصی سلطنتوں کو دیکھ جاؤ، جدید تمدن کے سارے مدعیوں کا جائزہ لو، ایسے لوگوں کے لئے کوئی مستقل انتظام کسی ملک میں موجود نہیں ہے، ایسے لوگوں کی زندگی محض اہل خیر کے رحم و کرم پر موقوف رہی ہے، سلاطین یا حکومتوں نے، پہلے یا موجودہ زمانہ میں جب کبھی ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی سلوک کیا ہے تو استحساناً، کبھی وہ اس کے لئے نہ قانوناً مجبور تھے، نہ ہیں، اور نہ انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔

اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے اس کو حکومت کا سب سے زیادہ ضروری کام

قرار دیا ہے، اسلام کا اقتصادی قانون اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہر مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہے، ٹھیک اوسی طرح جس طرح نماز، روزہ، اور حج فرض ہے، کوئی مسلمان زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار نہیں کرسکتا، اور جو انکار کرے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا، اسلامی حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ بیت المال قائم کرے اور زکوٰۃ کے اموال کو ایسے مجبور لوگوں پر خرچ کرنے کا انتظام کرے، اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ اسلامی حکومت جبرًا وصول کرے گی، اموال باطنہ جس کا حال حکومت کو نہ معلوم ہو سکے، یا جس کی حفاظت کا ذمہ حکومت نہ لے سکے، اوس کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے، اور بغیر اس فرض کو ادا کئے نجات نہیں ہوسکتی، البتہ ان اموال کا اختیار مالک نصاب کو ہے خود مستحقین کو دیدے یا وہ بھی بیت المال میں داخل کردے،

اسلامی تعلیم کی رو سے ملک کے کل اموال نامیہ کا چالیسواں حصہ اور کل پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ، اور کل جانوروں کا ایک مقررہ حصہ ہر سال ایسے لوگوں پر صرف کرنے کے لئے مخصوص ہے، اور اسلامی حکومت ذمہ دار ہے کہ یہ سب مال صحیح طور پر ایسے لوگوں میں تقسیم ہوجائے، کیا ابتداء آفرینش سے اب تک دنیا کے عقلا نے، کسی قوم یا کسی حکومت نے کبھی کوئی قانون یا کوئی قاعدہ ایسا بنایا ہے جو ایسے مجبور انسانوں کے لئے اس سے بڑھ کر یا اس کے مثل مفید ہو، اور قابل قبول بھی ہو، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔

سرمایہ داری اور غربت

ہمیشہ ہر ملک اور ہر قوم کی حالت یہ رہی ہے کہ ملک کا مختصر طبقہ دولتمند اور سرمایہ دار ہوتا ہے، اور اسی ملک کا بڑا حصہ غریب اور مفلس ہوتا ہے، سرمایہ دار دولت کی طاقت سے غریبوں کو ستاتے ہیں، مجبور رکھتے ہیں، اون سے جفاکشی اور محنت کا کام لیتے ہیں لیکن اون کے اور اون کے اہل و عیال کی ضروریات کے قابل بھی معاوضہ نہیں دیتے، انھیں غریبوں اور محنت کرنے والوں کی محنت سے بہت کچھ نفع حاصل کرتے ہیں، اور ناجائز عیش و عشرت میں صرف کرتے ہیں، لیکن مزدوروں کا حق المحنت کبھی بالکل نہیں دیتے، کبھی بمشکل

بہت کم دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دار سب ایک طرح کے ہوتے ہیں، نہ یہ مطلب ہے کہ سرمایہ داری فی نفسہ بُری چیز ہے، تمدّن و معاشرت کی ترقی کا ایک ضروری جزء سرمایہ ہے، علمی اور صنعتی ترقیوں میں زبردست حصّہ سرمایہ داروں کا ہے، اسلام نے مال کو حیوٰۃ دنیا کی زینت کہا ہے، سرمایہ داری کو خدا کا فضل بتایا ہے، دولتمندی خدا کی ایک نعمت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے، لیکن واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ داری کے ساتھ کبر، غرور، اور ظلم بھی عموماً ساتھ ہی ساتھ آتا ہے جو دنیا کی بدترین لعنت ہے۔

ہمیشہ اور ہر زمانہ میں سرمایہ داری اور دولتمندی کے ان تلخ نتائج کو روکنے کی عقلاء کوشش کی، مگر قطعاً کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، حتیٰ کہ بڑے بڑے غور و فکر کرنے والے یہ کہنے لگے کہ "دنیا غریبوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے" یعنی ان مظالم کا سدّباب ناممکن ہے، اور مفکرین ہی کی ایک جماعت اس نتیجہ پر پہونچی کہ اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری ختم کردی جائے، اور "اقتصادی مساوات" قائم کردی جائے۔

اقتصادی مساوات کی تحریک بھی غیر معلوم مدت سے دنیا میں جاری ہے، لیکن ایک وقت یونانیوں میں اس کا بڑا زور ہوا تھا، دوسری دفعہ ایران کے مزدکیوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس تک پورے ایران میں پوری قوت سے اس کو جاری رکھا، مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، سارا ملک تباہی میں مبتلا ہو گیا۔

یہی تحریک کچھ اصلاح کے ساتھ اب سوشلزم کے نام سے تقریباً یورپ کے کل ملکوں میں زور پکڑ رہی ہے، اور یہی تحریک کچھ عملی تبدیلی کے ساتھ کمیونزم کے نام سے روس کے نظام حکومت کی بنیاد بنی ہوئی ہے۔

میں نہایت اختصار کے ساتھ عرض کروں گا کہ مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات کی تحریک جس قسم کی بھی ہو، غیر فطری، غیر مستقل، اور سخت مضر ہے، اسلام ایسی تحریکوں

کو پسند نہیں کرتا، اسلام نے جس قسم کی مساوات کا حکم دیا ہے، وہ اور چیز ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

مساوات حقیقی یا اقتصادی مساوات

اقتصادی مساوات کو اصول قرار دینے کی ابتک دو صورتیں معلوم ہو سکی ہیں، ایک یہ کہ ملک کے جمیع اموال قابل انتفاع میں اباحتہ مطلقہ ہو، یعنی جس شخص کو جس چیز کی حاجت ہو اوس سے کوئی اوس کو روک نہ سکے، جیسا کہ مزدکیوں کا اصول تھا، اس صورت کا تجربہ ہو چکا کہ اباحتہ مطلقہ کے ساتھ نظم ملک ناممکن ہے، اور نظم نہ ہو تو تباہی لازم ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ملک کی کوئی قابل انتفاع چیز کسی کی ملک خاص نہو، نہ مباح مطلق ہو، بلکہ سب چیزیں اہل ملک کی ملکِ مشترک ہوں، جیسا کہ سوشلزم اور بالشویزم کا مشترک اصول ہے، اس صورت میں نظم حکومت ممکن ہے، لیکن اس کا استقلال ناممکن ہے، اس لئے کہ ملک کی پوری قوت اور ساری دولت عملاً حکومت اور فوج کے اقتدار میں ہو جائے گی، گو قانونی الفاظ میں کتنا ہی محدود کیا جائے، اور رعایا کی ساری قوت مسلوب ہو جائے گی، اوتنی بھی نہ رہے گی جتنی سرمایہ داروں کے نظام جمہوریت میں رہتی ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی باگ جب تک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی جو ایثار پیشہ ہوں، اور قانون کا اتباع کریں، نظم قائم رہے گا، لیکن اگر ارباب حکومت اور فوج قانون توڑنا چاہیں تو رعایا بالکل مسلوب الاختیار ہوگی، اور حکومت کے غیر قانونی افعال کی مدافعت اتنا بھی نہ کر سکے گی، جتنا سرمایہ دار ممالک کی رعایا کرتی ہے۔

سوشلزم اور بالشویزم کی تحریک کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوری طور پر غربا اور مزدور پیشہ لوگوں کی حالت سنبھل جائے گی، اور اون کو بہت سے مصائب سے نجات حاصل ہو جائے گی، اور یہی چیز ہے جس سے یہ تحریک آبادیوں کے کثیر حصہ کی کشش اور دلچسپی کا باعث بن گئی ہے، مگر ظاہر ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ تحریک ملک کی سخت

تباہی اور بربادی کا سبب بنے گی، ملک کی تمام مادی اور اقتصادی قوت کو ایک جگہ جمع کر دینا اور افراد ملک کو بالکل مفلوج بنا دینا سخت خطرناک طریقہ ہے، یہ کہنا کہ ملک کی جمع شدہ قوت و دولت قانوناً ملک کے افراد ہی کے قبضہ میں رہے گی، بڑا سخت دھوکہ ہے، قانونی قبضہ اور عملی قبضہ میں بڑا فرق ہے، روس کی تحریک ابھی ابتدائی منزل میں ہے، اور ابتک اونہیں لوگوں کے قبضہ میں رہی ہے، جو مخلص تھے، اور اپنے اصول کے واسطے ہر طرح کے ایثار و قربانی کے لئے طیار رہتے، لیکن اون کے ایثار و قربانی سے تحریک کے خطرناک پہلو کا سدباب نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ اگر اس خطرہ کا سدباب بھی ہوجائے، اور دنیا میں اقتصادی مساوات قائم بھی ہوجائے تو یہ چیز دنیا کے لئے مفید نہیں ہوسکتی، مضر ہوگی، فطرۃ اور منشاء الٰہی کے خلاف ہوگی، دنیا کا تمام کام اختلاف مراتب کی وجہ سے چل رہا ہے، اقتصادی فرق ہی وہ چیز ہے، جس کی وجہ سے انسان بڑے سے بڑا مشکل اور خطرناک کام انجام دے سکتا ہے، اسی فرق کی وجہ سے انسان سخت سے سخت دماغی اور جسمانی جدوجہد پر مجبور ہوتا ہے، اور یہی جدوجہد اور مسابقت ہر طرح کی علمی وصنعتی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے، فرق مراتب اور مالی امتیازات مٹا دئے جائیں تو علمی وعملی کاموں کی تکمیل بالکل ناممکن ہوجائے گی۔

اسلام نے نہ حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے، نہ اس کو قبول کیا، اور جائز رکھا، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، حضورؐ نے فرمایا: انزلوا الناس منازلھم، امیر کی اطاعت ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دی، ہر جماعت اور ہر خاندان کے لئے امیر و مامور کا سلسلہ قائم کردیا، حتی کہ حکم دیا: اذا کنتم ثلاثۃ علی سفر فلیؤموا احدکم، یعنی تین آدمی سفر میں رہو تو اپنے میں سے ایک کو امام بنالو، امیر و مامور کے علیحدہ علیحدہ حقوق بتا دئے، افراد و اشخاص کی ملکیت کو جائز تسلیم کیا، جائداد منقولہ میں بھی اور غیر منقولہ میں بھی، اور اسی بنا پر کسی پر زکوۃ فرض ہوئی کسی پر نہیں، کسی کو زکوۃ لینے کی اجازت دی، کسی کے لئے حرام کیا،

کسی پرحج فرض کیا کسی پر نہیں، ملکیت ہی کے جواز پر فرائض کا قانون لازمی قرار دیا کسی شخص کا مال بغیر اجازت جبراً لینا ناجائز کیا، حلال مال کے حصول وطلب کی رغبت دلائی، تجارت، ملازمت، حکومت، صنعت وحرفت اور مال جمع کرنے کے سارے حلال وسائل کی ترغیب دی۔

یہ ساری باتیں اس پر دال ہیں کہ اسلام نے انسان کے فرق مراتب کو جائز رکھا ہے، اور اوس کے ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے، سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے، اور خاص اسلامی احکام میں بھی اس کے فرق کو ملحوظ رکھا ہے، باوجود اس کے سرمایہ داری کے مذموم اثرات کو روکنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے جو نہ سوشلزم سے ہوسکتا ہے نہ کمیونزم سے۔

سرمایہ داروں کے مذموم طریقے

جس طرح سائنس فی نفسہ مذموم چیز نہیں ہے بلکہ انسان، انسانی قوت، انسانی تمدن، اور معاشرت کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لیکن جب ایسی سائنس کو انسان کی ہلاکت وتباہی اور ملک کی بربادی کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ دنیا کے لئے مصیبت بن جاتا ہے، یہی حال سرمایہ داری کا ہے، سرمایہ دار اگر اموال دنیا اور سرمایہ کو اچھے مصرف میں صرف کریں تو دنیا کو خوش حالی اور نیکی سے معمور کرسکتے ہیں، اور جس کو اللہ پاک توفیق عنایت فرماتا ہے وہ یہی کرتے ہیں، لیکن زیادہ یہی ہوتا ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ کی قوت سے غریب اور مفلس لوگوں کی جائدادیں اور مختصر زندگی کا سامان بھی چھین لیتے ہیں، اور تباہ وبرباد کردیتے ہیں،

سرمایہ دار کرتے یہ ہیں کہ غریبوں کو لالچ دیکر اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور رفتہ رفتہ اون کا خون چوس لیتے ہیں، دولتمندوں نے دولت کے ذریعہ ملک کی دولت جمع کرنے کے بہت سے طریقے ایجاد کئے، اور برابر ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

ان ترکیبوں میں سب سے زیادہ اہم اور عام چیز ربو (یعنی سود) کا کاروبار ہے، ربو کا اصول یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے خود انتفاع حاصل کرے، اور صاحب مال کسی نقصان

کا ذمہ دار نہ ہو، تاجر کتنا ہی ہوشیاری اور محنت سے کام کرے، کاریگر کتنا ہی جفاکشی اور ہوشیاری سے چیزیں بنائے، نقصان سے بے خطر نہیں ہو سکتا، اور سود خوار کتنا ہی کم سود لے، مگر اوس کا نفع مستقل اور پائدار ہوگا، اوس کو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے، نہ اوس کو جفاکشی اور محنت کرنی پڑتی ہے۔

بیع کی بے شمار قسمیں سرمایہ داروں نے ایسی بنائی ہیں جو صرف کشش زر کا ذریعہ ہیں، مثلاً سٹہ، یا بغیر مال کے فرضی بیع، اور بیع در بیع، یہ بیع نہیں ہے، نہ بیع کے لئے کوئی چیز موجود ہوتی ہے، محض سرمایہ جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔

انشیورنس سرمایہ داروں کی نئی ایجاد ہے، اور بڑی کامیاب ایجاد، زندگی کا بیمہ کرتے ہیں، چیزوں کا بیمہ کرتے ہیں، مکان کا بیمہ کرتے ہیں، اور گویا اموال اور زندگی کے تحفظ کا ایک حد تک ذمہ لیتے ہیں، اور اس ذمہ داری کے بدلہ بے حساب دولت جمع کر لیتے ہیں، غور کرو کہ بیمہ کمپنیاں تھوڑے دنوں میں کس طرح بے حساب دولت سمیٹ لیتی ہیں، یہ دولت کہاں سے آتی ہے، مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر، کاریگر اپنا خرچ گھٹا کر، تاجر اپنے نفع نقصان سے بے پرواہ ہو کر بخوشی اپنا مال ان کمپنیوں کے حوالہ کر رہے ہیں۔

موجودہ دور کی عجیب حالت ہے، یہ لوگ سرمایہ داروں کے مظالم سے تنگ آگئے ہیں، مختلف ملکوں کا بڑا حصہ سرمایہ داری کو بالکل مٹا دینے کا حامی ہے، باوجود اس کے دولتمندوں کے ان تمام ہتھکنڈوں کی تائید کر رہا ہے، جس پر سرمایہ داری کی بنیاد قائم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نمائشی مخالفت کے باوجود سرمایہ داری کو جو طاقت اس وقت حاصل ہے، وہ کبھی نہ تھی۔

اسلام نے نفس سرمایہ داری کو جائز رکھا ہے، مگر صرف اوس سرمایہ داری کو جو حلال، صحیح اور غیر مشتبہ طریقہ سے حاصل ہوئی ہو، سرمایہ داروں کے ان تمام مکر و فریب کے طریقوں کی سختی سے مخالفت کی ہے، اور سب کو ناجائز اور حرام کہا ہے، سود، جوا، سٹہ

بازی، بیمہ یعنی قسمت کی بازی، بیع کی ساری مجہول اور فرضی قسمیں، سب ناجائز اور حرام ہیں، اور جو سرمایہ ان طریقوں سے جمع ہو، وہ بدترین سرمایہ ہے۔

ربوا (یعنی سودخواری)

اسلام نے سودخواری کی بڑی سختی سے مخالفت کی ہے، سودخواری کو خدا کے ساتھ جنگ کہا گیا ہے، حضور صلعم نے غیر مسلم سودخواروں سے کبھی مصالحت نہ کی، نجران کے نصاریٰ کے ساتھ حضورؐ نے مصالحت کی تھی، جو صلح نامہ لکھا گیا اوس میں صاف طور سے حضور نے ظاہر کردیا کہ تم میں سے جو صاحب وجاہت سود کھائے گا اوس کا میں ذمہ نہیں لیتا، اطراف مدینہ میں یہود کے قبائل آباد تھے، اور یہ بڑے سودخوار تھے، اور یہود مشہور سودخوار قوم رہی ہے، اون کا مدینہ کے اطراف میں رہنا کسی شرط پر آپنے منظور نہ کیا، قرآن پاک نے سودخوار کی سزا خلود فی النار بتائی ہے جو کفر وعناد کی انتہائی سزا ہے، یہ سب سختیاں اسی لئے ہیں کہ سودخواری کے ساتھ دنیا کی اقتصادی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔

سود کی حالت یہ ہے کہ مال مقررہ نفع پر غریبوں میں، تجارت کرنے والوں میں، کاریگروں میں، مزدوروں میں، اور کاشتکاروں میں پھیل جاتا ہے، اور ان سب کی محنت و مزدوری کی کمائی کا ایک مستقل حصہ سرمایہ دار کے پاس جمع ہوتا رہتا ہے، ہر کام میں خسارہ اور نقصان بھی ہوتا ہے، وہ سارا نقصان محنت کرنے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے، سرمایہ دار اوس نقصان میں شریک نہیں ہوتا، بلکہ نقصان کی حالت میں بھی وہ اپنا مقررہ نفع غریب سے وصول کرتا ہے۔ X

سودخوار سب سے پہلے اپنے دوستوں کو، اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کو، پھر اون سب کو جو اوس کے ساتھ معاملہ کریں، تباہ کردیتا ہے، اور دوستی و ہمدردی کے ساتھ اوس کا سب کچھ لوٹ لیتا ہے، ہمیشہ سے یہود دنیا کی مشہور سودخوار قوم ہے، اسی لئے یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جو اون میں دولتمند ہیں، اون کی دولت کی انتہا نہیں ہے، اور جو غریب

ہیں اون کی پستی اور ذلت کی انتہا نہیں ہے ، ہندوستان میں ہندؤں کی ایک قوم ویش (بنیا) مہاجنی اور سودخواری میں مشہور ہے ، اس قوم کی سرمایہ داری اور دولتمندی کی بھی انتہا نہیں ہے ، مگر یہ دولت کہاں سے آئی ، اور کیونکر آئی ، اپنی ہی قوم کی غریب جماعت کو ان مہاجنوں نے تباہ کردیا ، ان کی ایک ایک کوڑی چھین لی ، اور شودر بنادیا ، تب یہ دولت جمع ہوئی ہے ، اور اب بھی اسی سودخواری کی لوٹ سے تباہ ہو ہو کر بہت سے کاشتکار اور مزدور پیشہ شودر بنتے جارہے ہیں ، جن کا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں رہتا ۔

یہود سودخواروں نے بالخصوص اور دوسرے سرمایہ داروں نے علی العموم اس وقت دنیا میں بینکنگ کا جال پھیلادیا ہے ، اور اس ذریعہ سے دنیا کی تجارت ، دنیا کی صنعت ، دنیا کی محنت ، اور دنیا کی پیداوار پر اس طرح قبضہ کرلیا ہے کہ کوئی شخص تجارت ، پیداوار ، دماغ سوزی اور محنت سے منتفع نہیں ہوسکتا ، جب تک ان سرمایہ دار سودخواروں کو اس میں سے کچھ حصہ نہ دے لے ، اس کا علاج کیا ہے ، کیا یہ کہ اون کے روپے چھین کر غریبوں میں تقسیم کردئے جائیں ، اور اون کو پھر ویسا ہی اپنا جال پھیلانے کی اجازت دیدی جائے ، یا یہ کہ اس جال کو ہمیشہ کے لئے فنا کردیا جائے ، یعنی سودی معاملات کو روک دیا جائے تاکہ ہمیشہ کے لئے ان مظالم کا قطعی سدباب ہوجائے ۔

بعض صحاب جو اقتصادیات سے قطعاً ناواقف ہیں ، کہا کرتے ہیں کہ ایسی سودخواری جس میں سود زیادہ لیا جائے ، اور حاجتمند یا مفلسوں سے لیا جائے بیشک بُری ہے ، مگر تاجروں کو جو روپیہ سود پر دیا جائے کہ وہ تجارت کریں ، یا جو روپیہ دولتمند بنکوں سے سود کا لیا جائے اوس کی بُرائی کی کوئی وجہ نہیں ہے ، بلکہ تجارت کی ترقی کا ذریعہ ہے ، ایسے لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ بینک کا کیا کام ہے ، اور جو روپیہ بینک سے سود کا ملتا ہے ، وہ دولتمندوں کا ہوتا ہے یا غریبوں کا ، بینک کو بینکنگ میں مدد دینا اپنی قوم ، اپنے ملک ، اور ملک کے غریب طبقہ ، اور چھوٹے تاجروں کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے کے ہم معنی ہے ، بینک میں روپیہ جمع کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ بینک اپنے ظالمانہ کام

کو وسیع پیمانہ پر جاری کر سکے، غریب تاجر، غریب کاریگر اور غریب کاشتکار سے بڑی رقم سود کی وصول کرے، اور اس میں سے ایک حصہ ان لالچی جمع کرنے والوں کو بھی دیدے، سود کا روپیہ دولتمندوں کے سرمایہ میں سے نہیں ملتا، غریبوں ہی کی جیب سے نکل کر آتا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض کمزور مسلمان سرمایہ داری کے خلاف بھی ہیں، لیکن ظالم سودخواروں کو دولتمند دیکھکر سودخواری کے جواز کے خواہشمند بھی ہیں، اسلامی تعلیم کی اصلاح کے طالب ہیں، وہ علماء کے اس پرانے خیال پر روتے ہیں کہ علماء نے مسلمانوں کو سود سے روک کر غریب بنادیا، وہ بعض مولویوں کو ملاکر کم از کم بینک کے سود کے جواز کا فتوی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، میں ایسے لوگوں کے خلوص اور نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا مگر اس مسئلہ پر مزید غور وفکر کی دعوت دیتا ہوں، اگر مسلمانوں میں ہندو کروڑپتی مہاجنوں کی طرح کوئی سودخوار جماعت نہ پیدا ہوئی تو یہ رونے کی چیز نہیں ہے، رونے کی چیز وہ ہوگی کہ غریبوں کو ہم خود لوٹنے لگیں، یا خود نہ لوٹیں مگر لوٹنے والوں کی مدد کریں، اور لوٹ کے مال میں حصہ بانٹنے لگیں، اگر ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہم میں کروڑپتی مہاجن پیدا ہوں تو ہمیں یہ بھی پسند کرنا ہوگا کہ ہم میں تباہ حال شودر بھی پیدا ہوں، کیونکہ کروڑپتی زیادہ تر اپنی ہی قوم کو لوٹ کر کروڑپتی بنتے ہیں۔

الغرض دولت اور سرمایہ دنیا کے تمام کاموں کا ایک ضروری جزء ہے، تجارت، صنعت وحرفت، علمی ترقی، فن کی تکمیل، سب کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے، اسلام نے محنت اور جفاکشی کی طرح سرمایہ کو بھی حصول انتفاع کا ایک ذریعہ تسلیم کیا ہے، لیکن جفاکشی اور محنت کرنے والا جس طرح نفع کا مستحق ہوتا ہے، اوسی طرح نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح سرمایہ دار کو بھی نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہونا چاہئے، تبادلہ میں کوئی حصہ بغیر معاوضہ وبدل لیا جائے، یا سرمایہ کے عوض صرف مقررہ نفع لیا جائے، اور نقصان کا سرمایہ دار ذمہ دار نہ ہو تو ایسا معاملہ ناجائز وحرام ہوگا، نہ کوئی مسلمان خود ایسا معاملہ کرسکتا ہے، نہ ایسی قوم کے ساتھ موافقت کرسکتا ہے، جو اس طرح کا معاملہ کرے۔

مسلمانوں پر منجملہ فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ دنیا سے ایسے ظالمانہ کاروبار کو مٹائیں، کیونکہ یہ چیز دنیا کے کمزور طبقہ کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

غلامی

میں یہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ معاملات کے تمام مسائل پر بحث کرنا ناممکن ہے، جس قدر میں نے عرض کیا وہ غالباً اتنی بات کے لئے بہت کافی ہے کہ اوس سے اسلامی تعلیم کا عقلی معیار معلوم ہوجائے، لیکن بعض ایسی باتیں ہیں جس کے متعلق جدید تمدن باتفاق اسلامی تعلیم کو قابل اعتراض سمجھتا ہے، ان چیزوں میں سب سے اہم غلامی کا مسئلہ ہے۔

جدید تمدن نے انسانیت کی بلاشبہہ یہ ایک عظیم الشان خدمت انجام دی ہے کہ دنیا سے غلاموں کی تجارت کو بڑی حد تک مٹا دیا ہے، اور جو کچھ باقی ہے، اب وہ بھی انشاء اللہ مٹ کر رہے گی، علماء جدید کو تعجب ہے کہ اسلام نے اس ظالمانہ فعل کی کیسے اجازت دیدی، میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام غلامی اور رقیت کے جواز کا حکم بھی دیتا ہے، لیکن غلامی کے مٹانے کی جو کوشش جدید تمدن کر رہا ہے، اوس کو اسلام بہت ہی مستحسن فعل بھی تسلیم کرتا ہے، ذرا غور و فکر کی ضرورت ہے۔

یورپ اسی غلامی سے واقف ہے جو یورپ اور امریکہ کے تاجر کیا کرتے تھے، اون کا عموماً قاعدہ یہ تھا کہ حبش، نیوبیا اور افریقہ کے دوسرے علاقوں میں جاتے تھے، اور وہاں کے آزاد باشندوں کی اولاد کو حاصل کرتے تھے، کبھی اوس کے والدین یا رشتہ داروں کو روپیہ کا کچھ لالچ دیکر، اور کبھی وہاں کے چور اور بدمعاشوں کے ذریعہ اغوا کرا کر، اور انہیں لڑکوں کو یورپ اور امریکہ میں لاکر فروخت کردیتے تھے، اور یہی لڑکے غلام ہوجاتے تھے، پھر یہ ظالم تاجر یا خریدار آقا ان غلاموں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے، اوس کی داستان سے انسانیت لرزہ براندام ہوجاتی ہے، اس موضوع پر صدہا کتابیں یورپ اور امریکہ میں شائع ہوئی ہیں، اور وہ ایک سے ایک شدید ظالمانہ قصوں سے لبریز ہیں۔

کیا اسلام نے اسی غلامی کی اجازت دی ہے، استغفر اللہ من ذلک، اسلام نے نہ ماں باپ کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو بیچ سکیں، نہ اون کے بیچنے سے آزاد لڑکا غلام ہو سکتا ہے، نہ چوروں یا بدمعاشوں کے بیچنے سے کوئی آزاد لڑکا غلام ہو سکتا ہے، نہ کوئی خلیفہ یا بادشاہ اپنی آزاد رعایا کو بیچ سکتا ہے، پھر کیا اوس سلوک کی اسلام نے اجازت دی ہے جو یورپ اور امریکہ کے بردہ فروشوں نے غلاموں کے ساتھ کئے ہیں، اسلامی احکام ساری دنیا میں شائع ہیں، کیا اس کے جواز کا ایک اشارہ بھی کہیں موجود ہے، مسلمانوں میں تیرہ ۱۳ سو برس سے غلامی اور رقیت جاری ہے، اس عرصہ میں مسلمان اچھے برے نیک اور بد ہر طرح کے ہوئے، مگر کیا مسلمان غلاموں کی مظلومی کی داستانوں کا ایک رسالہ بھی ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جو ان مظالم کے مثل ہو، قطعاً ناممکن ہے، بشرطیکہ محض تہمت اور بددیانتی سے جھوٹے قصے نہ گڑھے جائیں۔

غلطی یہ ہوئی ہے کہ محض اشتراک لفظی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام اور مسلمان جس غلامی کی اجازت دیتے ہیں، وہ وہی ہے جو یورپ اور امریکہ کے بردہ فروشوں میں رائج تھی۔

جہانتک اسلامی تعلیم کا غلامی کے جواز سے تعلق ہے، وہ اپنے مقصد کے لئے ایک بہترین نظم ہے جس سے بہتر صورت ممکن ہی نہیں ہے، اسلام میں حربی اور جنگی قیدی کو زندہ رکھنے کی ایک صورت غلام بنا رکھنا بھی ہے، اور بس، دوسری کسی صورت سے کوئی آزاد غلام نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے انتظام یہ رکھا ہے کہ جس قدر حربی مخالفین قید ہوں، اون میں سے کچھ تبادلہ میں چھوڑ دئے جاتے ہیں، کچھ مالی عوض لیکر چھوڑ دئے جاتے ہیں، کوئی اس طرح چھوڑ دئے جاتے ہیں کہ امیر کے سامنے کسی خاص مدت تک کوئی خاص اسلامی خدمت انجام دینے کا ذمہ لیں، اور قیدیوں میں جو شدید دشمن ہوں، اور اون کا چھوڑنا اسلامی حکومت اور مسلمانوں کے لئے خطرہ سے خالی نہ ہو، اون کو قتل کر دیا جاتا ہے، نہ ایسے لوگ تبادلہ میں چھوڑے جا سکتے ہیں، نہ مالی معاوضہ میں، جو قیدی بالکل بے ضرر ہوں، اون کو بلا کسی معاوضہ کے بھی چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ

حضور صلعم نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر کیا تھا حربی قیدیوں کے ساتھ یہ سب سلوک حضور کے وقت میں ہوا جیسا کہ اصح السیر کی کتاب المغازی میں مختلف مقام پر میں نے مدلل ذکر کر دیا ہے۔

لیکن ایسے قیدی جن کو نہ کفار معاوضہ میں چھوڑائیں، نہ مالی معاوضہ ادا کریں، نہ ایسے شدید خطرناک ہوں کہ اون کو قتل کر دینا ضروری سمجھا جائے، نہ ایسے بےضرر ہوں کہ اون کو بلا معاوضہ چھوڑا جائے، نہ وہ اسلام کی کوئی خاص خدمت انجام دینے کی اہلیت رکھتے ہوں، ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہئے، یہ ایک مشکل مسئلہ تھا، ایک حل اس مشکل کا اسلام نے پیش کیا ہے، اور دوسرا حل وہ ہے جو آج جدید تمدن اور یورپ کی جمہوریتوں میں جاری ہے، اہل نظر خود غور کریں کہ ان دو میں کون سی صورت عقلاً و اخلاقاً بہتر ہے، اور کون بدتر۔

اسلام نے بھی اور جدید متمدن دنیا نے بھی ایسے قیدیوں کو قید ہی میں رکھنا طے کیا ہے، مگر دونوں کے طریقہ میں فرق ہے، جمہوری سلطنتیں اور شخصی حکومتیں سب یہ کرتی ہیں کہ ایسے قیدیوں کو بلند چار دیواری کے اندر بند کر دیتی ہیں، یا کسی غیر آباد جزیرہ میں بھیجدیتی ہیں، اور اون سے سخت جفاکشی اور محنت کا کام لیتی ہیں، اور اون کے کھانے کپڑے اور رہنے کا تمام خرچ رعایا سے وصول کرتی ہیں، کبھی جدید ٹیکس لگا کر اور کبھی خزانہ عامہ سے وہ خرچ پورا کرتی ہیں۔

اسلام نے یہ نہیں کیا، وہ ایسے قیدیوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیتا ہے، اور اون کے اخراجات نگرانی اور تحفظ کا سارا بار مجاہدین ہی پر ڈالتا ہے، اس کے معاوضہ میں ہر طرح کی خدمت لینے کا اختیار مجاہدین کو دیتا ہے، اور ملک رقبہ و بیع و شری کا اختیار بھی مجاہدین کو دیتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی شخص ان قیدیوں کی کفالت قبول نہ کر سکتا، کیونکہ بسا اوقات ان کے لئے یہ بار عظیم ہو جاتا، لیکن ساتھ ہی اسلام نے غلاموں کو اختیارات دئے ہیں، اور قواعد بتائے ہیں کہ وہ اگر چاہیں تو جدوجہد کر کے آزاد ہو سکتے ہیں۔

اب مسئلہ قابل غور یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے قیدیوں کے لئے یہ دائمی قید با مشقت بہتر ہے جو متمدن ممالک میں جاری ہے، یا وہ غلامی بہتر ہے جو اسلام نے تجویز کی ہے۔

اسلام نے غلاموں کے لئے بہت سے حقوق مقرر کئے ہیں، آزادی حاصل کرنے کے بہت سے مواقع عطا کئے ہیں، علمی فضل وکمال اور صنعت و حرفت کی تعلیم اگر وہ حاصل کرنا چاہیں تو اون کو اس کا اختیار دیا ہے، کھانا، کپڑا اور طریق بود وباش میں اون کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی سخت تاکید کی ہے، غلاموں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والوں کے لئے سزا اور تعزیر مقرر کی ہے، جو لوگ غلامی پر اعتراض کرتے ہیں، وہ اوس کا چوتھائی سلوک بھی اپنے قیدیوں کے ساتھ نہیں کر سکتے متمدن ممالک میں جو کھانا قیدیوں کو دیا جاتا ہے ویسا غلاموں کو دینا جائز نہیں ہے، جس طرح اون کو رکھا جاتا ہے اوس طرح غلاموں کو رکھنا جائز نہیں ہے، غلاموں نے غلامی کی حالت میں یا جد جہد کے بعد آزاد ہوکر علوم وفنون حاصل کئے، بڑے بڑے ائمہ فن اور صاحب کمال ہوئے، اور پھر مسلمانوں نے اونہیں کو اپنا سرتاج بنایا، مکہ میں عطا بن ابی رباح، یمن میں طاؤس، یمامہ میں یحیی بن ابی کثیر، کوفہ میں ابراہیم، بصرہ میں حسن بصری، شام میں مکحول، خراسان میں عطاء خراسانی ایک ہی وقت میں بڑے بڑے ائمہ اسلام اور فقیہہ تھے، اور اونہیں پر علوم شریعۃ اور فتووں کا مدار تھا، حالانکہ یہ سب اصلاً غلام ہی تھے۔

اس کے برخلاف تمام اقوام کی تاریخ پڑھ جاؤ، اسلامی غلامی پر اعتراض کرنے والے سارے متمدن ممالک کی حالت دیکھ جاؤ، اس قسم کا کوئی قیدی کبھی صاحب فضل وکمال ہوا، نہیں ہوا، اور نہیں ہو سکتا، اوس کو ایسے مواقع حاصل ہی نہیں ہو سکتے، کیا ایسے صریح فرق کے باوجود غلامی کے اسلامی اصول پر اعتراض کرنا، اور قید کے ظالمانہ سسٹم کو جاری رکھنا حق اور انصاف کی بات ہے، یا دیوانگی اور حماقت ہے، قید کے سسٹم میں مالیات کا نقصان اس پر اضافہ ہے، غلامی کے اصول میں کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں ہے، اور قیدیوں کی نگرانی اور حفاظت بہترین طریقہ پر ہو جاتی ہے، برخلاف اس کے قید کی سسٹم کی وجہ سے بڑی بڑی اونچی دیوار کے بہت سے قید خانے بنانے پڑتے ہیں، بڑا اسٹاف، بہت زیادہ ملازم، بہت سے نگراں، وسیع دفتر اور بہت سے ذمہ دار افسر رکھنے پڑتے ہیں، اور اون سب کا خرچ بلا وجہ جبراً

رعایا سے وصول کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے جنگی قیدیوں سے صرف مسلمانوں ہی کو واسطہ نہیں پڑتا، ہر زندہ قوم کو اس سے واسطہ پڑتا ہے، مگر غلامی پر اعتراض کرنے والے بتائیں کہ کسی قوم نے کبھی اسلام کے غلامی سسٹم سے بہتر اس کا کوئی علاج تجویز کیا، نہیں کیا، اور اس کا ایسا بہتر مکمل اور قابل عمل علاج کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا، نادانی سے جس چیز پر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ ایسا بہتر طریق انتظام ہے، جس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہے۔

علوم شرعیہ کی تاریخ

اسلامی تعلیمات پر اور بھی اسی طرح کے بہت سے اعتراضات ہیں، سب پر ایک تقریر میں بحث نہیں ہو سکتی، تاہم ایک نہایت اہم چیز باقی رہ جائے گی، اگر خود مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے متعلق کچھ نہ عرض کردوں، مسلمانوں کے اس وقت بہت سے فرقے موجود ہیں، اون میں بڑے سخت اختلافات ہیں، اور ہر فرقہ اپنے ہی طریقہ کو اسلام کہتا ہے، ایک حق کا متلاشی جب یہ جاننا چاہے کہ جو اسلام جناب محمد عربی رسول خدا صلعم لائے تھے، وہ کیا تھا تو اوس کو بڑی پریشانی ہوتی ہے، اس لئے میں اسلامی تعلیمات کی ایک مختصر تاریخ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں، اس سے وجوہ اختلاف اور فرقہ بندیوں کے اسباب بھی کسی حد تک معلوم ہوجائیں گے، اور سمجھدار آدمی جو اصل اور صحیح اسلامی تعلیم جاننا چاہے، اوس کو اس کا طریقہ بھی معلوم ہوجائیگا۔

جناب سرور عالم رسول خدا محمد مصطفی صلعم جو کچھ خدا کی طرف سے لائے، اوس میں ایک قرآن پاک، اللہ کا کلام ہے، یہ مسلسل اور متواتر روایتوں کے ساتھ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، دوسری چیز حضور کے اقوال و افعال ہیں، یعنی حضور کی تعلیم اور خود حضور کا عمل اور طریقہ، یہ چیزیں اگرچہ قرآن پاک کے الفاظ میں موجود نہیں ہیں، لیکن اللہ پاک نے فرمایا ہے: وما ینطق عن الهوی ان هو الا وحی یوحی، اس وجہ سے وہ سب بھی تعلیمات الٰہیہ میں داخل ہیں، اور باتفاق ماجاء به الرسول کو قبول کرنا اسلام کی پہلی شرط ہے، اوس میں

یہ سب داخل ہیں -

حضورؐ سے بلاواسطہ جن حضرات نے یہ تعلیم حاصل کی، وہ صحابہ کرام کی جماعت تھی، اون کا علم بلاواسطہ مشکوۃ نبوت سے ماخوذ تھا، اون کے علوم کی سند تھی: عن رسول اللہ صلعم عن جبرئیل علیہ السلام عن رب العلمین، یہ صحابہ کرام کا وہ شرف تھا جس میں کوئی عالم یا کوئی ولی اون کا شریک و مماثل نہ ہوا، نہ ہوسکتا ہے، آیات و احکام اون کے سامنے نازل ہوئے، محل نزول اور واقعات و حالات سے وہ بلاواسطہ واقف تھے، اللہ پاک نے حضور کی شان میں فرمایا: یتلوا علیہم ایاتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتاب والحکمۃ اور جس کا تزکیہ نفس خود حضور فرمائیں، اوس کی روحانیت کا کمال اندازہ سے باہر ہے، اسی واسطے اہل علم متفق ہیں، الصحابۃ کلھم عدول، اور حضور نے فرمایا ہے: الصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم -

البتہ صحابہ کے مدارج میں علم و فہم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، صحابہ کرام میں سے جن حضرات نے مسائل استنباط کئے، یا فتوے دئے، اون کی تعداد ایک سو بیس[۱۲] سے کچھ زیادہ ہے، جیسا کہ ابن قیم نے ذکر کیا ہے، ان میں بھی زیادہ ایسے ہیں جن سے دو ایک مسئلے مروی ہیں بیس سے کم ایسے اصحاب ہیں، جن کے فتاوے اور مسائل زیادہ ہیں، لیکن سات اصحاب وہ ہیں جن کی روایات اور فتاوے بہت زیادہ ہیں: حضرت عمر بن الخطاب، زید بن ثابت، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، ام المومنین عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے فتاوے اس قدر ہیں کہ ایک ضخیم جلد بن سکتی ہے، امیر المومنین مامون کے پوتے نے صرف حضرت ابن عباس کے فتووں کو جمع کیا تھا جن سے بیس کتابیں بنی تھیں، حضرت علی کے احکام، فتاوے اور قضایا بہت تھے، مگر علماء نے اون کی روایتیں چھوڑ دیں کیونکہ شیعوں نے بہت سی جھوٹی باتیں ملا دیں جس سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز مشکل ہوگئی، اصحاب صحاح نے اون کی وہی روایتیں لی ہیں جو اون کے اہل بیت روایت

کرتے ہیں، یا جو عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں نے اون سے روایت کیا ہے، جیسے عبیدہ السلمانی اور شریح وغیرہ۔

اصحاب کرام نے اپنے علوم اپنے بعد کے لوگوں تک پہونچا دئے، مگر بعد کے لوگوں میں دین، فقہ اور علوم کی اشاعت صرف چار اصحاب کے شاگردوں کے ذریعہ سے ہوئی، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، اہل مدینہ نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر کے شاگردوں سے علوم اخذ کئے، اہل مکہ نے عبداللہ بن عباس کے شاگردوں سے، اور اہل عراق نے عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں سے۔

مدینہ طیبہ

تابعین کے پہلے طبقہ میں وہ سات علماء ہوئے جو علم کے دریا سمجھے جاتے ہیں، اور فقہاء سبع کے نام سے مشہور ہیں، سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ بن مسعود، اور سلیمان بن یسار، ان کے زمانہ میں اور بھی بڑے بڑے صاحب افتا تھے، مثلاً ابان بن عثمان، سالم، نافع، ابوسلمہ بن عبدالرحمن بن عوف، علی بن الحسین رضی اللہ عنہم، ان لوگوں کے بعد مدینہ میں یہ حضرات صاحب علم و اصحاب فتوی ہوئے، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، اور اون کے دو لڑکے، محمد اور عبداللہ، عبداللہ بن عمر بن عثمان، اور اون کے لڑکے محمد، محمد بن الحنفیہ کے دو لڑکے عبداللہ اور حسین، جعفر بن محمد بن علی، عبدالرحمن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر، محمد بن المنکدر، محمد بن شہاب الزہری۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ زہری کے فتاووں کو فقہ کے ابواب کی ترتیب سے محمد بن نوح نے جمع کیا تو تین بڑی جلدیں ہوئیں، عراک بن مالک نے فرمایا کہ علماء مدینہ میں تفقہ کے اعتبار سے سب سے بڑا مرتبہ سعید بن المسیب کا تھا، رسول اللہ کے اور حضرات ابوبکر و عمر و عثمان کے قضایا کو سب سے زیادہ وہ جانتے تھے، اور سلف کے طریق عمل کا علم بھی سب سے زیادہ اونھیں کو تھا، عروۃ بن الزبیر علم احادیث میں بے مثل تھے، اور علم کی جو بات کسی کے پاس نہ ملتی تھی

وہ عبیداللہ بن عبداللہ کے پاس ملتی تھی، مگر وہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک ان سب سے ابن شہاب زہری کا علم بڑھ گیا، انہوں نے ان سب کے علوم کو جمع کیا، اور ان سب کے بعد امام مالک صاحب نے علماء مدینہ کے مرویات، آثار، قضایا، اجتہادات، طریق عمل، اور فتاووں کو جمع کیا، اور وہی ممالک مغرب، افریقہ، مراکش اور تونس وغیرہ میں خوب پھیلا، اور یہی مالکی مذہب کہلایا۔

کوفہ

صحابہ کرام کے بعد کوفہ بھی علم کا مرکز ہوگیا تھا، وہاں تابعین میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء تھے، علقمہ بن قیس نخعی، اون کے چچا اسود بن یزید النخعی، شرجیل الہمدانی، مسروق بن الاجدع، شریح بن الحارث قاضی، سلیمان بن ربیعۃ الباہلی، حارث بن قیس الجعفی، عبدالرحمن بن یزید النخعی، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود قاضی، خیثمہ بن عبدالرحمن، سلمہ بن صہیب، مالک بن عامر، عبداللہ بن سخبرہ، عمرو بن میمون الاودی، ہمام بن الحارث، حارث بن سوید، یزید بن معاویۃ النخعی، عتبۃ بن فرقد، وصلہ بن زفر، شریک بن حنبل، ابو وائل شقیق بن سلمہ، علیبہ بن فضلہ، یہ سب حضرات، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی کے شاگرد ہیں، اور تابعین کے طبقہ میں بڑے پایہ کے علماء ہیں، اصحاب رسول اللہ کی موجودگی میں ان سے فتوے لئے جاتے تھے، اور صحابہ کرام اوس کی تصدیق فرماتے تھے، ان میں سے اکثر نے حضرت عمر، حضرت عائشہ، اور حضرت علی سے بھی علوم حاصل کئے، عمرو بن میمون الاودی حضرت معاذ بن جبل سے بھی ملے، اون سے علم حاصل کیا، حضرت معاذ نے وفات کے وقت ان کو وصیت کی تھی کہ عبداللہ بن مسعود سے علم حاصل کرو، چنانچہ انہوں نے اُن کی وصیت پر عمل کیا۔

انہیں حضرات کے وقت میں عبدالرحمن بن ابی لیلی ہوئے جنہوں نے ایک سو بیس (۱۲۰) صحابہ سے علم حاصل کیا، اسی طرح عبداللہ بن مسعود کے دو صاحبزادے ابو عبیدہ اور عبدالرحمن

تھے، اور اسی وقت میسرہ اور ضحاک وغیرہ تھے۔

ان کے بعد وہ حضرات ہوئے جن کے پاس کوفہ کے تمام علوم تھے، جیسے عامر شعبی، سعید بن جبیر، قاسم بن عبدالرحمن، محارب بن دثار، حکم بن عتبہ اور ابراہیم بن النخعی، امام سرخسی مبسوط کی کتاب اللقیط میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی کے اقوال کو سب سے زیادہ ابراہیم نخعی جانتے تھے، جو قول ابراہیم کا صحیح ثابت ہو جائے، وہ گویا اون دونوں سے منقول کے مثل ہوگا۔

ان کے بعد حماد بن ابی سلیمان، سلیمان بن المعتمر، سلیمان الاعمش اور مسعر بن کدام ہوئے، پھر محمد بن عبدالرحمن، عبداللہ بن شبرمہ، شریک القاضی، قاسم بن معن، سفیان ثوری، اور ابوحنیفہ ہوئے۔

امام ابوحنیفہ نے ابراہیم نخعی اور کوفہ کے تمام علوم کو جمع کیا، اس سے باہر نہیں ہوئے، ابراہیم کے مذہب پر استنباط اور استخراج مسائل میں ان کا بڑا عظیم الشان مرتبہ تھا، اور غالباً سب سے پہلے انہیں نے استخراج اور استنباط کے اصول مرتب کئے، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے امام محمد نے امام مالک سے موطا پڑھی، اور علماء مدینہ کے مذاہب سے واقف ہوئے، پھر موطا کی ایک ایک روایت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کے مذہب کا مقابلہ کیا جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے، اور موطا امام محمد کو دیکھنے سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے، جہاں اتفاق ہوا، اوس کو مقبول رکھا، جہاں اختلاف ہوا، وہاں سلف کے آثار اور تعامل کی طرف رجوع کیا، کہیں امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دی اور برقرار رکھا، کہیں اوس سے اختلاف کیا، امام محمد صاحب کی کتابیں اور قاضی ابو یوسف صاحب کے قضایا سارے عراق، ایران، ماوراء النہر، اور ترکستان میں پھیل گئے، اور وہی حنفی مذہب ہوا۔

مکہ مکرمہ

حضرت ابن عباس کے بڑے بڑے جلیل القدر شاگرد مکہ میں تھے، اور اونہیں سے وہاں

علم کی اشاعۃ ہوئی، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، مجاہد بن جبیر، عبید بن عمیر، عمرو بن دینار، عبداللہ بن ابی ملیکہ، عبدالرحمن بن سابط وغیرہ مرجع علم و فتوی تھے، پھر اون کے بعد ابو الزبیر المکی، عبداللہ بن خالد بن اسید، اور عبداللہ بن طاؤس ہوئے، اور پھر ابن جریج اور سفیان بن عیینہ ہوئے جو احادیث و آثار کے جامع تھے، پھر اون کے بعد امام شافعی کا زمانہ ہوا -

امام شافعی امام مالک کے بھی شاگرد تھے، اور امام محمد کے بھی، اس کے علاوہ دوسرے بلاد میں بھی بڑے بڑے علماء موجود تھے، جیسے بصرہ، شام، یمن، مصر وغیرہ، اون کے علوم بھی اسی طرح صحابہ اور مشاہیر و مستند علماء تابعین سے منقول تھے، امام شافعی نے ان سب پر نظر کی، اور دیکھا کہ بہت سی مرسل اور منقطع روایتوں پر عمل ہو رہا ہے، جس کی کوئی اصل نہیں معلوم ہوتی، اس لئے شاید سب سے پہلے مرسل روایتوں کے قبول کرنے کے لئے کچھ شرائط اور قواعد مرتب کئے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے، ان قواعد کی وجہ سے بہت سے مسائل میں امام شافعی صاحب کا قول دوسرے بلاد کے علماء اور طریقہ سلف سے مختلف ہو گیا، اور وہی حجاز، یمن، اور عرب کے دوسرے ممالک میں پھیل گیا، اور شافعی مذہب ہوا -

سلف کے طریقے

پیچھے فقہاء نے جس طرح احکام کی قسمیں مقرر کیں، فرائض، واجبات، سنن اور مکروہ، حرام، مباح وغیرہ، اور سب کے مکمل حدود و ضوابط بنائے، حضور کے وقت میں تعلیم کی یہ صورت نہ تھی، حضور نے فرمایا: صلوا کما رأیتمونی اصلی، جس طرح مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو، ویسے ہی پڑھو، اسی طرح وضو کر کے بتا دیا، حجۃ الوداع کے وقت فرمایا کہ مجھے دیکھ کر اچھی طرح حج کا قاعدہ یاد کر لو شاید اس کے بعد میں حج نہ کر سکوں -

صحابہ کرام کی تعلیم کا طریقہ بھی زیادہ تر اسی طرح تھا، اسی لئے تمام بلاد میں یہ دستور ہو گیا

کہ جو طریقہ انہوں نے سلف سے سیکھا تھا، اوسی پر وہ قائم رہے، کیونکہ اپنے بلاد کے علماء پر اور اون کے تبحر علمی پر اون کو اعتماد اور بھروسہ تھا، اور اوسی طریقہ کو وہ رسول اللہ کا طریقہ سمجھتے تھے، اور یہی سمجھکر اوس پر عمل کرتے تھے، دوسرے بلاد کے علماء سے نہ اچھی طرح واقف تھے، نہ واقف ہونے کے ذرائع آسان تھے، نہ دوسرے بلاد کی روایتوں کو جانچنے کے اصول منضبط تھے، پھر حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ کے بعد جس طرح سیاسی حالت پریشان کن تھی، اوسی طرح بہت سے فتنہ پرداز پیدا ہو گئے تھے، جو جھوٹی روایتیں رسول اللہ کی طرف یا کسی صحابی کی طرف منسوب کر دیتے تھے، اس لئے دوسرے بلاد کی روایتوں کو جانچنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ جب صحابہ اور تابعین کا مذہب کسی مسئلہ میں مختلف ہو تو ہر عالم کے نزدیک اپنے بلد والوں اور اپنے شیوخ کا مذہب مختار ہوتا ہے، کیونکہ اپنے شیوخ کے صحیح اور غلط قول کو بآسانی پہچان سکتا ہے، اسی لئے اہل مدینہ کے لئے عمر، عثمان، ابن عمر، عائشہ، زید بن ثابت، سعید بن المسیب، عروہ، سالم، عطا، قاسم، زہری، یحیی بن سعید وغیرہ علماء مدینہ کے اقوال دوسرے بلاد کے علماء کی بہ نسبت راجح اور احق بالاخذ ہیں، اسی لئے امام مالک صاحب کے یہی لوگ حجۃ ہیں اور وہ انہیں سے استدلال لازمی سمجھتے ہیں، اور اہل کوفہ کے نزدیک عبد اللہ بن مسعود اور اون کے شاگردوں کا مذہب، حضرت علی، شریح اور شعبی کے قضایا، ابراہیم نخعی کے فتاوے اخذ کے قابل ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ اسی طبقہ کے لوگوں نے تدوین شروع کی، مدینہ میں امام مالک، اور محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذویب نے، مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے، کوفہ میں ثوری نے، بصرہ میں ربیع ابن الصبیح نے کتابیں لکھیں، اور سب نے اسی اصول کو پیش نظر رکھکر علوم کو مدون کیا۔

سلف کی دو احتیاطیں اور محدثین

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ امام مالک اور سفیان کے زمانہ میں دو خیال کے علماء تھے، ایک وہ جو لوگوں کو مسائل بتانے، اور حرام و حلال، اور فرائض و واجبات سمجھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ بغیر اس کے تو دین کی تعلیم ہی نہیں ہو سکتی، لیکن کسی حدیث کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرنے سے بہت ڈرتے تھے، امام شعبی نے فرمایا کہ نبی سے کم درجہ کے لوگوں کی طرف نسبت کرنا ہمیں زیادہ پسند ہے، کیونکہ اگر کچھ کمی زیادتی ہو جائے تو نبی کی طرف نہ ہوگی، (اور کذب علی الرسول کی معصیت نہ ہوگی) ابراہیم نے کہا کہ عبداللہ اور علقمہ کا قول ہی بیان کر دینا ہمیں زیادہ پسند ہے، خود حضرت عبداللہ بن مسعود جب رسول اللہ کی طرف کوئی قول منسوب کرتے تھے تو اون کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا، اور کہتے تھے، ہکذا او نحوہ، ہکذا او نحوہ، حضرت عمر نے صحابہ کی ایک جماعت کو کوفہ بھیجا تو اُن سے کہا کہ وہاں مشتاقوں کی ایک جماعت تمہارے پاس آئے گی، اور کہے گی کہ اللہ اکبر، یہ رسول اللہ کے صحابی ہیں، اور تم سے رسول اللہ کی حدیث پوچھے گی، تو روایت کم بیان کیجیو۔

یہ لوگ اپنے بلاد کے علماء و مشایخ کے علوم و تحقیق پر کامل اعتقاد رکھتے تھے، انہیں کی تعلیم کو رسول اللہ کی تعلیم سمجھتے تھے، اور اون کا خلاف کرنا پسند نہ کرتے تھے، علقمہ نے کہا کہ کیا عبداللہ سے بڑھکر کوئی ثبت اون لوگوں میں ہے، امام ابو حنیفہ نے کہا کہ ابراہیم سالم سے زیادہ سمجھدار اور فقیہہ تھے، اور اگر صحابیت کا فرق نہ ہوتا تو ہم کہتے کہ علقمہ ابن عمر سے زیادہ فقیہہ تھے، یہ لوگ اسی وجہ سے دوسرے بلاد کے علماء و مشائخ کی طرف کم متوجہ ہوتے تھے۔

اور سعید بن المسیب، ابراہیم اور زہری کے زمانہ میں، اور اسی طرح امام مالک اور سفیان کے زمانہ میں بہت سے علماء تھے، جو رائے اور خوض سے منع کرتے تھے، فتوی

اور استنباط سے ڈرتے تھے، کہ کہیں کوئی حلال چیز حرام یا حرام حلال نہ ہو جائے، فتوی اوسی وقت دیتے تھے جب اس سے نجات نہ ہو، ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ ہر ضرورت کے وقت خود رسول اللہ کی حدیث ملے، عبد اللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، عمر، علی، ابن عباس رضی اللہ عنہم سب سے مروی ہے کہ یہ لوگ اون مسائل میں فتوی دینا یا کلام کرنا مکروہ سمجھتے تھے جن کے متعلق کوئی آیۃ یا رسول اللہ کی حدیث موجود نہو، جابر بن یزید بصرہ کے فقیہ تھے، اون کو حضرت ابن عمر نے وصیت کی کہ رائے سے مسئلہ نہ بیان کیا کرو، حضرت ابو سلمہ بصرہ گئے تو انہوں نے حضرت حسن بصری کو بھی وصیت کی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی ایک جماعت کو توفیق عنایت فرمائی، اونہوں نے بڑی محنت، بڑی جانفشانی، اور بڑی کوشش سے رسول اللہ کی حدیثیں جمع کرنا شروع کیں، تمام بلاد کے اشخاص اور رواۃ کے حالات معلوم کئے، صحیح کو غیر صحیح سے جدا کیا، اور جہاں جہاں کے متعلق معلوم ہوا کہ کوئی حدیث رسول اللہ کی وہاں ہے، تمام مشکلات اور تکالیف کو برداشت کرکے وہاں گئے، اور اوس حدیث کو جمع کیا، اور تقریباً تمام ابواب فقہ کے لئے جو فقہا میں مروج تھے، مرفوع روایتیں مہیّا کیں، اور خود رسول اللہ کی تعلیمات کا ایک بے مثل اور لازوال دفتر جمع کر دیا، محدثین کی جماعت نے اسلام کی یہ وہ خدمت انجام دی جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی، اس طبقہ کے رؤساجن کو رئیس المحدثین کہنا چاہیئے، یہ لوگ ہیں:

عبد الرحمن بن المہدی، یحیی بن سعید القطان، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، ابوبکر ابن ابی شیبہ، مسدد، ھناد، احمد بن حنبل، اسحاق بن راھویہ، فضل بن دکین، علی المدینی اور اون کے ساتھی۔

اس سے پہلے فقہاء امصار کے پاس اپنے اپنے بلدہ کے صحابہ و تابعین کے آثار بہت تھے، لیکن مرفوع متصل روایتیں دوسرے بلاد کی جمع نہیں کر سکتے تھے، شاہ ولی اللہ

صاحب نے ابوداؤد السجستانی کی ایک تحریر کا ذکر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ سفیان اور وکیع اور اون کے معاصرین بڑی کوشش کرتے تھے مگر اون کے پاس روایۃ مرفوع متصل ہزار سے کم ہی جمع ہو سکی تھیں، ابن ہمام نے لکھا ہے کہ امام شافعی نے امام احمد بن حنبل سے کہا کہ تم لوگ اخبار صحیحہ ہم سے زیادہ جانتے ہو، جب خبر صحیح ہو تو ہمیں بھی بتاؤ تاکہ ہم بھی اس پر عمل کریں، چاہے وہ خبر کوفی ہو، یا بصری، یا شامی۔

وجہ یہ تھی کہ بہت سی صحیح حدیثیں ہیں جن کو ایک ہی بلدہ کے اشخاص روایت کرتے ہیں، جیسے افراد شامیین، افراد عراقیین وغیرہ، بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن کو ایک ہی گھر کے لوگ روایۃ کرتے ہیں، جیسے برید بن عبداللہ بن ابی بردہ کا نسخہ جس کو وہ عن ابی بردہ عن ابی موسی الاشعری روایت کرتے ہیں، یا جیسے عمرو بن شعیب کا نسخہ جو عن ابیہ عن جدہ مروی ہے، بعض صحابہ بہت کم روایت بیان کرتے ہیں، اور اون سے بہت کم لوگوں نے سنا، اس قسم کی روایتیں عامہ اہل فتوی اور علماء بلاد کو نہ مل سکیں، اور سب علماء حدیث کی کوششوں سے جمع ہوئیں، حتی کہ بعض چالیس ہزار حدیث تک روایت کرتے تھے، جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے، اور خود امام احمد صاحب کی مسند اس کی شاہد ہے۔

فقہاء و محدثین کا طریق عمل

احادیث کے جمع ہونے کے بعد جو فقہاء و محدثین کا اختلاف رہا، اوس کی وجہ یہ نہ تھی کہ فقہاء امصار میں سے کوئی ایک شخص بھی اس کا قائل ہو کہ رسول اللہ کی حدیث صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی اس پر قیاس کو ترجیح دینا جائز ہے، اساطین امۃ کی طرف تو ایسا وہم بھی درست نہیں ہے، باتفاق فقہاء و محدثین سب کے نزدیک مقدم کتاب اللہ ہے، اوس کے بعد سنت رسول اللہ ہے، اور سب کے نزدیک قیاس کا درجہ سب کے بعد ہے۔

اختلاف کی وجہ دوسری ہے، محدثین کہتے ہیں کہ جب سند صحیح سے رسول اللہ کی حدیث ثابت ہو جائے تو اوس پر عمل ضرور ہے، گو سلف کا اوس پر عمل نہ ہو، فقہاء کہتے ہیں کہ سلف میں متروک العمل ہونا اوس حدیث کے ترک کی علت ہوگی، مثلاً قلتین کی روایت

ہے۔ فقہاء سبعہ کے زمانہ میں اس پر عمل نہ ہوا۔ اس وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو متروک العمل سمجھتے ہیں۔ امام شافعی اور محدثین کہتے ہیں کہ بہت طریقوں سے بسند صحیح یہ حدیث مروی ہے۔ اور صحابہ کے زمانہ میں اس پر عمل بھی ہوا ہے۔ اس واسطے اون کا اس پر عمل ہے۔

اور اصل حال یہ ہے کہ مثلاً اہل کوفہ کو لیجئے۔ محدثین کی روایتیں جمع ہونے کے بعد اون کو کیا کرنا تھا۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی کے وقت سے نماز، روزہ۔ اور تمام عبادات و معاملات کا ایک طریقہ اون میں جاری تھا۔ رسول اللہ کے بہترین صحابی حضرت عبداللہ اور حضرت علی سے اون لوگوں نے سیکھا تھا۔ اور اُسی کو وہ رسول اللہ کا طریقہ سمجھتے تھے۔ گو وہ سب باتیں روایۃً بسند متصل محدثین کے قاعدہ سے مروی نہ تھیں۔ مگر عملاً سلف سے خلف میں نقل ہوتی ہوئی آئی تھیں۔ محدثین روایات کے جمع ہونے کے بعد کہتے ہیں کہ اس میں فلاں طریقہ اوس روایۃ کے خلاف ہے جو مدینہ کے فلاں عالم کہتے ہیں۔ اور ایک طریقہ اوس روایۃ کے خلاف ہے جو شام کے عالم روایۃ کرتے ہیں۔ اہل کوفہ اپنے سلف کے تعامل کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس تعامل کو بھی رسول کی تعلیم سمجھتے ہیں۔ محدثین بھی روایات کی صحت کے لئے بہت سی شرطیں لگاتے ہیں۔ لیکن فقہاء نے سلف کے تعامل اور متقدمین کے فتاؤں کو ترک کرنے کے لئے مزید احتیاط ضروری سمجھی۔ غیر بلاد کی اون روایات پر جو اپنے ائمہ اور مشائخ کی تعلیم کے خلاف ہو۔ زیادہ قیود ضروری سمجھیں۔ ورنہ محدثین اور فقہا سب متفق ہیں کہ مسائل منصوصہ میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

فقہاء و محدثین مسائل توحید و عقائد میں متفق ہیں۔ اس پر سب متفق ہیں کہ ما جاء به الرسول کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اسلام وہی ہے جو رسول اللہ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام شرعی کے اثبات کے لئے سب سے مقدم کتاب اللہ ہے۔ اور اوس کے بعد رسول اللہ کا قول یا فعل۔ سب کا اتفاق ہے کہ کوئی

حکم کتاب وسنت میں نہ ملے، نہ سلف کا طریقہ معلوم ہو تو بدرجہ مجبوری قیاس جائز ہے، قیاس سے مراد دلائل عقلی نہیں ہے، بلکہ قیاس شرعی، یعنی مسائل منصوصہ کی علت پر غیر منصوصہ فروع کا استخراج اور بس، الغرض فقہا، ومحدثین کا اختلاف علمی اختلاف ہے، اصل مقصد میں دونوں متحد ہیں، دونوں کی غرض یہی ہے کہ ٹھیک ٹھیک رسول کے طریقہ پر عمل ہونا چاہئے، اگر اوس طریقہ کے معلوم کرنے کے وسائل وذرائع میں اختلاف ہے یا تعلیم کا مطلب سمجھنے میں اختلاف ہے، اس قسم کے اختلافات صحابہ کرام اور بڑے بڑے تابعین میں تھے، ان میں سے کسی کو گمراہی یا غیر اسلامی طریقہ نہیں کہہ سکتے، یہ اختلافات بدنیتی پر مبنی نہیں ہیں، اور فقہا، ومحدثین دونوں باوجود اختلافات کے رہبران دین اور معلمین اسلام ہیں۔

معتزلہ، خوارج، قدریہ، جبریہ

فقہا، ومحدثین جن کا اوپر ذکر ہوا، سب سنّت رسول اور سلف صالحین کے طریقہ کو اصل اصول سمجھتے تھے، ان میں اختلافات بھی تھے، مگر تفریق نہ تھی، تمام علما، اور اون کے متبعین ایک دوسرے سے مسائل پوچھتے تھے، روایتیں لیتے تھے، اور سب اہل سنت والجماعۃ کے نام سے موسوم تھے، لیکن پہلی صدی کے آخر میں ایسے لوگ ہوئے جنھوں نے عقلی بحثیں شروع کر دیں، پھر قدر وجبر، توحید عقلی اور ذات وصفات باری تعالیٰ پر بحثیں ہونے لگیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے متضاد فرقے پیدا ہو گئے، یہ فرقے ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھے، اور سب عقلی دلائل سے اپنے عقیدہ کو حق اور دوسرے کو باطل کہتے تھے، معتزلہ صفات باری تعالیٰ کا انکار کرتے تھے، وہ کہتے تھے صفات ازلیہ وقدیمہ کا ثبوت شرک ہے، ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کوئی چیز قدیم نہیں ہے، صفاتیہ کہتے تھے کہ صفات باری تعالیٰ سب ازلی قدیم ہیں، اور کسی صفت کی ازلیت سے انکار کفر ہے، قدریہ بندہ کو اپنے جمیع افعال پر قادر اور صدور فعل میں مختار بلکہ افعال کا خالق سمجھتے تھے، جبریہ انسان کو مجبور محض جانتے تھے، اسی طرح مرجئہ اور وعیدیہ متقابل تھے، اور شیعہ وخوارج متقابل تھے۔

حضرت حسن بن یسار بصری، بصرہ میں بڑے پایہ کے فقیہہ و محدث تھے، ان کے والد یسار، زید بن ثابت انصاری کے غلام تھے، اور ان کی ماں خیرہ ام المومنین ام سلمہ کی لونڈی تھیں، اور حسن بصری نے حضرت ام سلمہ کا دودھ بھی پیا تھا، حضرت عمر کی خلافت میں دو برس باقی تھے کہ یہ پیدا ہوئے، پانچسو صحابہ رسول اللہ سے ملے، اور حدیثیں لیں، بڑے زبردست فقیہہ ہوئے، ان کے شاگرد کبار علماء اسلام ہیں، ابن قیم لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے حسن بصری کے فتوؤں کو جمع کیا تھا جن کی سات بڑی جلدیں ہوئی تھیں، اور انھیں کے شاگرد واصل بن عطاء، معبد جہنی، اور غیلان بن مسلم وغیرہ تھے جنہوں نے اعتزال کے مذہب کی بنیاد ڈالی۔

واصل بن عطا نے پہلے محمد بن الحنفیہ کے دونوں لڑکے امام ابو ہاشم عبد اللہ اور امام حسن بن محمد بن الحنفیہ سے اصول کا علم حاصل کیا، پھر فقہ حسن بصری سے پڑھتا تھا، اوسی وقت حسن بصری سے لوگوں نے سوال کیا کہ ایک جماعت وعیدیہ خوارج کی ہے جو اصحاب کبائر کو کافر کہتی ہے، ان کے نزدیک گناہ کبیرہ انسان کو ملت سے خارج کر دیتا ہے، دوسری جماعت مرجئہ ہے، جو کہتی ہے کہ گناہ کبیرہ سے ایمان میں کوئی خرابی نہیں آتی، بلکہ ان کے نزدیک عمل ایمان کا جزء ہی نہیں ہے، ان دونوں میں حق پر کون ہے، قبل اس کے کہ حسن بصری کچھ جواب دیں، واصل نے کہا کہ نہ اصحاب کبیرہ کو ہم مطلق مومن کہتے ہیں، اور نہ مطلق کافر، بلکہ اوس کا درجہ ایمان اور کفر کے درمیان ہے، اور اوس نے اس جواب پر اصرار کیا، اور حسن نے اوس کو اپنی مجلس سے نکال دیا، اوس نے معبد جہنی کے ساتھ مل کر اپنی علحدہ مجلس قائم کی، اور اعتزال کے قواعد مرتب کئے، واصل بن عطا ۸۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۳۱ھ میں فوت ہوا، معبد جہنی، واصل بن عطاء کا ساتھی ہے، قدر کے مسئلہ میں اس نے اہل سنت کا خلاف شاید واصل سے بھی پہلے کیا تھا، اور واصل کے بعد معتزلہ کا بھی امام ہوا۔

ابو عثمان عمرو بن عبید، مشہور متکلم معتزلی ہے، اوس نے بھی پہلے ابو ہاشم عبد اللہ بن

حنفیہ سے اصول پڑھا، پھر واصل سے بھی پڑھا، اور فقہ وحدیث حسن بصری سے حاصل کی، علوم شرعیہ کا بڑا عالم تھا، مگر معتزلی ہونے کی وجہ سے اعتبار سے ساقط ہے، یہ بھی ۸۰ھ میں پیدا ہوا، جو واصل کی پیدائش کا سنہ ہے۔

ابو مروان غیلان بن مسلم الدمشقی، قبطی الاصل ہے، اور حسن بصری کا یہ بھی شاگرد ہے، اس کے متبعین غیلانیہ کہلاتے ہیں، امام اوزاعی نے فرمایا کہ قدر کے مسئلہ میں سب سے پہلے معبد جہنی نے کلام کیا، پھر غیلان نے۔

یہ سب مشہور ائمہ معتزلہ ہیں، اور انھیں لوگوں نے مسائل اصول وعقائد پر پہلے پہلے عقلی بحثیں چھیڑیں جس سے مسلمانوں میں فرقہ سازی کی وبا پھیل گئی، اور اس قدر فرقے بن گئے، ان لوگوں نے توحید، عدل، وعد، وعید، سمع، عقل، سب کے معنی میں اہل سنت سے اختلافات کئے، اور سب کے جدید معنی پیدا کئے۔

اہل سنت توحید کی تعریف کرتے ہیں: ان اللہ تعالیٰ واحد فی ذاتہ لا قسیم لہ، وواحد فی صفاتہ الازلیۃ لا نظیر لہ، وواحد فی افعالہ لا شریک لہ۔

اور معتزلہ کہتے ہیں: ان اللہ تعالیٰ واحد فی ذاتہ لا قسیم لہ، ولا صفۃ لہ، وواحد فی افعالہ لا شریک لہ، یعنی وہ خدا کے تمام صفات ازلیہ کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ تعدد قدما محال ہے، اسی لئے قرآن کو حادث اور مخلوق کہتے ہیں، کلام اللہ نہیں کہتے، وہ متفق ہیں کہ ارادہ، سمع، بصر، کلام کوئی صفت قائم بذات باری نہیں ہے۔

عدل، اہل سنت کہتے ہیں کہ خدا کا عدل یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے، اپنی ملک و مملک میں تصرف کرتا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو ارادہ کرتا ہے حکم دیتا ہے، جور کی نسبت خدا کی طرف ممکن ہی نہیں ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ عدل وہی ہے جو عقل اور حکمۃ کے موافق ہو، یعنی صحیح اور مصلحۃ کے موافق کام ہو تو عدل ہے، گویا خدا کا وہ کام جو عقل کے خلاف ہو ظلم ہے۔

ائمہ معتزلہ خود آپس میں بھی مختلف الرائے ہیں، مگر وصل بن عطار جو اس فرقہ کا بانی ہی، اوس کے مسائل کی بنیاد فی الواقع چار اصول پر ہی:

(۱) نفی صفات باری تعالیٰ،

(۲) کفر و ایمان کے درمیان ایک جدید درجہ کا اثبات،

(۳) مسئلہ قدر معبد جہنی اور غیلان دمشقی کا مسلک،

(۴) وہ کہتا ہی کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے فریقین میں سے ایک ضرور مخطی ہی، یعنی کبیرہ کا مرتکب ہی، مگر متعین نہیں ہی کہ کون فریق مخطی ہی، اسی طرح عثمان اور اون کے قاتل میں سے ایک ضرور فاسق ہی، بلا تعیین، اور یہ معلوم ہو چکا ہی کہ فسق و کبائر کا حکم ان کے نزدیک کیا ہی، اس لئے وہ کہتا ہی کہ کم از کم حکم ان فریقین کا یہ ہی کہ اون کی شہادت معتبر نہیں ہی، چنانچہ ان کے نزدیک حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر وغیرہ، کوئی مقبول الشہادۃ نہیں ہیں۔

ان لوگوں کی وجہ سے بڑا فتنہ پیدا ہوا، امام ابوحنیفہ کی پیدائش بھی ۸۰ھ میں ہوئی، اور اون کے اجتہاد کا زمانہ عین اس فتنہ کی اشاعت کا زمانہ ہی، طاش کبریٰ زادہ مفتاح السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ یحیی بن شیبان نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہی، وہ کہتے ہیں کہ ان مبتدعین کی جماعتوں میں سب سے زیادہ بحث و جدل کرنیوالے معتزلہ تھے، جو بصرہ میں تھے، اور روافض و مرجئہ وغیرہ زیادہ کوفہ میں تھے، اسی لئے میں بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ گیا اور تمام سال یا کم و بیش وہاں ٹھہرا، خدا کے فضل سے سب مغلوب ہوئے، نہ ان سب کو کتاب و سنت کی پرواہ تھی، نہ سلف صالح کے طریقہ کی۔

معتزلہ کا زور بڑھتا رہا، پھر اون میں بشر بن غیاث المریسی ہوا، جس نے خلق قرآن کے مسئلہ کو پھر زندہ کیا، اور وہ ارجاء کی طرف بھی مائل تھا، یہ شخص امام ابو یوسف کے تلامذہ میں تھا۔

اونھیں میں مسلم بن خالد تھا، یہ مشایخ شافعیہ میں ایک شخص مکہ میں تھا، مگر غیلان بن مسلم

کا شاگرد تھا، اور وہ معتزلہ کا امام تھا جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔

پھر حفص القرد ہوا جو معتزلہ کا ایک مناظر تھا، اور اوس سے امام شافعی کا مناظرہ بھی ہوا تھا۔

واصل اور معبد کے زمانہ میں یونان کی معقولات کا ترجمہ نہیں ہوا تھا، پیچھے جب خلفاء عباسیہ کے زمانہ میں یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو معتزلہ کے اصولوں میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں، اور ان مبتدعین کی قوت بہت بڑھ گئی، حتی کہ مامون الرشید کے زمانہ میں وہ آفت برپا ہوئی جس سے روح لرزجاتی ہے۔

قاضی احمد بن ابی دوّاد ایک ذی علم، فصیح البیان عالم تھا، یہ شخص صیاج بن العلاء السلمی کا شاگرد تھا، اور صیاج معتزلہ کا امام اور واصل بن عطاء کا شاگرد تھا، احمد بن ابی دوّاد کا اثر مامون الرشید پر بہت تھا، اس نے خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون کو اپنے موافق کر لیا۔

مسئلہ خلق قرآن

مامون نے ۲۱۸ھ میں ایک خط اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم کو بغداد لکھا، اوس کا خلاصہ مضمون یہ تھا:

ہمارے جمہور علم اور استدلال کی روشنی سے بے بہرہ ہیں، وہ خدا اور مخلوق میں فرق نہیں کرتے، سب متفق ہو گئے ہیں کہ قرآن قدیم ہے، اس کو خدا نے پیدا نہیں کیا، اور خدا کہتا ہے: انا جعلناہ قرآناً عربیاً، اور جو مجعول ہے، وہ مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے: نقص علیک من انباء ما قد سبق، خدا نے خبر دی کہ قرآن میں حادث چیزوں کے قصے بیان کئے ہیں، پھر یہ لوگ اپنے اقوال کو سنۃ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اپنے کو اہل الحق والجماعۃ کہتے ہیں، اور دوسروں کو اہل باطل اور کفرہ، تو جو قضاۃ تمہارے پاس ہیں، اون کو جمع کرو، میرا خط سناؤ، اور کہہ دو کہ ہم ایسے لوگوں کو نہیں چاہتے جو خدا کے ساتھ ایک اور قدیم غیر مخلوق کو شریک کرتے ہیں، اور اون سے پوچھو کہ قرآن کے مخلوق ہونے کے متعلق وہ کیا کہتے

ہیں، اور مامون نے سات علماء کا نام بالتخصیص لکھا تھا۔

(۱) محمد بن سعد کاتب الواقدی (۲) یحیی بن معین (۳) ابوخیثمہ (۴) ابومسلم مستملی یزید بن ہارون (۵) اسمعیل بن داؤد (۶) اسمعیل بن ابی مسعود (۷) احمد بن ابراہیم الدورقی۔

اسحاق بن ابراہیم نے ان علماء کو بلاکر خط سنایا تو اونھوں نے پہلے جواب میں توقف کیا، لیکن پھر خوف سے قبول کرلیا، یحیی بن معین وغیرہ کہتے تھے کہ ہم سب نے تلوار کے خوف سے قبول کیا تھا، یہ اطلاع مامون کو گئی تو اوس نے دوسرا خط لکھا کہ جو علماء رہ گئے ہیں، اون کو حاضر کرکے پوچھو،

اس دفعہ زیادہ علماء بلائے گئے، جن میں یہ حضرات بھی تھے:

(۱) احمد بن حنبل (۲) بشر بن الولید الکندی (۳) ابوحسان الزنادی (۴) علی بن ابی مقاتل (۵) الفضل بن غانم (۶) عبیداللہ بن عمر القواریری (۷) علی بن الجعد (۸) سجادہ (۹) قتیبۃ بن سعید (۱۰) محمد بن نوح العجلی (۱۱) یحیی بن عبدالرحمن العمری (۱۲) ابونصر التمار (۱۳) محمد بن حاتم بن میمون وغیرہم۔

مامون کا خط پیش ہوا، بڑا تھدیدآمیز تھا، مگر اون لوگوں نے نہ اقرار کیا، نہ انکار، ساکت رہے، جواب پر زیادہ مجبور کیا گیا تو کہا کہ ہم صرف اتنا کہتے ہیں کہ قرآن کلام اللہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے، اسحاق بن ابراہیم کے سوال پر بعض نے کہا کہ قرآن مجعول ہے، اسحاق نے کہا کہ اور مجعول مخلوق ہے، کہا، ہاں، اسحاق نے کہا کہ تب قرآن مخلوق ہے، کہا کہ یہ ہم نہیں کہتے کہ قرآن مخلوق ہے۔

اسحاق بن ابراہیم نے ان کے جوابات مامون کو بھیجدیئے، مامون نے پھر لکھا کہ جو قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کرے، اوس کو فتوی، روایۃ اور تفسیر بیان کرنے سے روک دو، بشر اور ابن مہدی اگر اقرار کرلیں تو اوس کو مشتہر کردو، اور نہ اقرار کریں تو دونوں کی گردن ماردو، اور ان دونوں کے سوا جو اس شرک سے باز نہ آئے، اون کو باندھکر امیرالمومنین

کے لشکر میں بھیجدو، اس خط کے بعد سب نے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرلیا سوائے چار علماء کے۔

احمد بن حنبل، سجادہ، محمد بن نوح اور قواریری۔

اسحاق بن ابراہیم نے ان چار کو قید کیا، اور دوسرے دن پھر پوچھا تو سجادہ نے اقرار کرلیا، تیسرے دن پھر پوچھا تو قواریری نے بھی اقرار کرلیا، باقی دو احمد بن حنبل اور محمد بن نوح کو طرطوس روانہ کیا، خبر ملی کہ مامون کا انتقال ہوگیا ہے، اور راستہ ہی میں محمد بن نوح کا انتقال ہوگیا۔

حضرت امام احمد بن حنبل پہونچے تو معتصم خلیفہ ہوچکا تھا، اور مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ کی اشاعت کے لئے وصیت کی تھی، احمد بن ابی داؤد وہاں موجود تھا، امام پر زور دیا گیا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرلیں، امام نے فرمایا کہ ہمیں کتاب وسنت سے سمجھا دیا جائے امام نے دلائل بھی دئے مگر سب نے نہ مانا، آخر معتصم کے حکم سے امام عالی شان کو روزہ کی حالت میں کوڑے مارے گئے، بدن پھٹ گیا، خون جاری ہوگیا، مگر کوڑا بند نہ ہوا، حتی کہ امام مظلوم بے ہوش ہوگئے، تب اون لوگوں نے چھوڑ دیا، امام کے صاحبزادے یعنی صالح بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ قید کے زمانہ سے کوڑہ کھانے اور رہائی پانے تک اٹھائیس مہینے ہوے تھے۔

اسی خلق قرآن کے فتنہ میں استاد احمد بن نصر الخزاعی شہید ہوئے، واثق نے اون سے پوچھا کہ قرآن کے بارہ میں کیا کہتے ہو، انہوں نے فرمایا کہ قرآن کلام اللہ ہے، اس پر واثق نے خود اپنے ہاتھ سے اون کو قتل کیا، اور اون کے لوگوں کو قید کردیا، نعیم بن حماد کا قید ہی میں انتقال ہوگیا۔

خلق قرآن کا فتنہ ۲۱۸ھ سے شروع ہوا، اور ۲۳۴ھ تک قائم رہا، اس کے شرارے اطراف ملک میں پھیلے، اور بڑے بڑے اہل اللہ اور باخدا اس کی وجہ سے مصائب میں مبتلا

ہوے، آخر خلیفہ متوکل نے اس فتنہ کو فرو کیا۔

خلق قرآن کے فتنہ کی فرو ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ واثق بعض مقید علماء سے ملنے آیا، اوس کے ساتھ احمد بن ابی دواد بھی تھا، اوس نے اون علماء سے پوچھا کہ خلق قرآن کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں، بعض نے کہا کہ تم یہ بتاؤ کہ جو تم کہتے ہو یہ رسول اللہ اور ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کو بھی معلوم تھا، یا نہیں، کہا کہ معلوم تھا، شیخ نے کہا کہ اون لوگوں نے بھی تمہاری طرح لوگوں کو اوس کی دعوت دی، یا سکوت کیا، کہا کہ سکوت کیا، شیخ نے کہا کہ پھر کیا تمہارے لئے وہ سکوت جائز نہیں ہے جو اون کے لئے جائز تھا، احمد بن ابی دواد اس پر ساکت اور مبہوت ہوگیا، اور واثق پر اس کا بڑا اثر ہوا، اور بار بار شیخ کے الفاظ کو دہراتا تھا: فهل لا وسعك ما وسعهم من السكوت، مگر فتنہ کو رفع کرنے میں عملی اقدام متوکل نے کیا، قرآن کو مخلوق کہنے سے لوگوں کو روکا، اور تمام آفاق میں اس مضمون کا حکم لکھکر بھیجدیا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تین خلفاء نے عظیم الشان کام انجام دئے، حضرت ابوبکر نے ارتداد کا فتنہ فرو کیا، خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے مظالم کا سدباب کیا، اور خلیفہ متوکل نے معتزلہ کے اس فتنہ کو روک دیا، فجزاہم اللہ۔

علم کلام

خلیفہ متوکل باللہ کے وقت میں خلق قرآن کا فتنہ رُک گیا، مگر اعتزال کی قوت مٹی نہیں اور زیادہ ہوگئی تھی، ہارون اور مامون کے زمانہ میں یونان کے فلسفہ کا ترجمہ ہوا تھا، اوس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے علماء اوسی کے ہوکر رہ گئے، معتزلہ متقدمین کسی نہ کسی طرح آیات و احادیث کو اپنے عقلی مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے، اور اوس وقت مبتدعین کے جو دوسرے فرقے تھے وہ بھی کسی حد تک نصوص کو پیش نظر رکھتے تھے، مگر ان تراجم کے بعد تو یہ بھی جاتا رہا، معتزلہ سے بڑھکر فلاسفہ اسلام ہوئے، جنہوں نے حکماء یونان کے الٰہیات کو توحید کی تعلیم کے لئے اصل الاصول تسلیم کر لیا، اس کا جو اثر ہوا تھا اوس کا اندازہ فارابی،

بوعلی سینا، طوسی اور ابن رشد کی تصنیفات سے اچھی طرح ہو سکتا ہے، یہ لوگ توحید اور عقائد کے علم کا ذریعہ صرف عقل کو سمجھتے ہیں، اور نقلیات سے تعرض بھی نہیں کرتے، الا ماشاء اللہ، اگر کہیں ذکر بھی آیۃ یا حدیث کا آگیا ہے تو اوس کی حیثیت اصل دلیل اور حجۃ کی نہیں ہے، ان لوگوں نے حکما، اور فلاسفہ کے بہت سے اقوال کو خاص الہیات میں ترجیح دی ہے، اور اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ اسلام کیا کہتا ہے۔

امام الہدی ابو منصور ماتریدی اور امام المتکلمین ابو الحسن الاشعری البصری نے ۳۰۰ھ کے بعد معتزلہ ہی کے طرز پر عقلی دلائل سے ان فرقوں کا مقابلہ شروع کیا، اور فقہاء و محدثین کے مسلک کو اصلی اسلامی تعلیم تسلیم کر کے دلائل عقلی سے اوس کی تائید اور مبتدعین کی تردید کی، اور اون کے عقلی توہمات سے جو شبہات پیدا ہوتے تھے اون کا ازالہ کیا، اس طرح بڑی حد تک ان فرقوں کی قوت ٹوٹ گئی، دو سو برس تک معتزلہ کے مباحث کو علم اصول اور علم کلام کہا جاتا تھا، اور فقہا، و محدثین اس کو بہت برا سمجھتے تھے، چنانچہ امام شافعی نے فرمایا کہ جو شخص ہر طرح کے گناہ و کبائر میں مبتلا ہو مگر شرک سے بچا ہوا ہو، وہ اوس سے اچھا ہے جو علم کلام میں مشغول ہو۔

لیکن امام اشعری اور ماتریدی کے بعد علم کلام کی وہ حالت نہ رہی، بلکہ اس میں فقہاء و محدثین اہل سنت والجماعت کی مدلل تائید ہونے لگی، اور علم کلام ایک اہم مذہبی علم ہو گیا۔

البتہ ایک چیز علم کلام کی اب بھی فقہا، و محدثین کے مسلک سے جدا ہے، معتزلہ کہتے تھے کہ عقائد اور اصول و معارف کی باتیں اور اسی طرح اعمال و احکام سب عقلی ہیں، کسی کام کا حسن و قبح اور کسی امر کی بھلائی اور برائی بھی عقل ہی کے ذریعہ جانی جاتی ہے، اور اوامر و نواہی کی بنیاد عقلی حسن و قبح ہے، متکلمین اوامر و نواہی اور تمام فروعات کا حسن و قبح سماعی کہتے ہیں، لیکن عقائد اور اصول و معارف کو وہ بھی عقلی کہتے ہیں، اور اس کی دو وجہ بتاتے

ہیں، اول یہ کہ جزم و اعتقاد تقلیدی قابل اعتبار نہیں ہے، یہ دلائل و براہین ہی سے حاصل ہوتا ہے، دویم مسموعات ظنی ہیں، اور ظن یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔
لیکن یہ صحیح نہیں ہے، برہان و دلیل سے جو بات ثابت ہوتی ہے اوس کا علم استدلالی ہوتا ہے، یقینی نہیں، علم یقینی صرف انبیاء کرام کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے، اور انبیاء کی تعلیم دلائل و براہین عقلیہ سے نہیں معلوم ہو سکتی، دویم جو بات برہان سے ثابت ہوگی اوس کے متعلق یہ کیونکر معلوم ہوگا کہ نبی اور رسول کی یہی تعلیم تھی، واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

۵۶۳۰

(مطبوعہ معین پریس دہلی)

اصح السیر صحت روایات، کثرت واقعات، اور ترتیب کی خوبی کے اعتبار سے سیرت کی بہترین تصنیف ہے، فن سیرت کے اصول کو پیش نظر رکھکر بڑی جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اصح السیر کا حصہ اول شائع ہو گیا ہے، اس میں اسلامی مالیات کے متعلق معلومات کا ایسا نادر ذخیرہ ہے جو اس کتاب کے سوا کسی جگہ نہیں مل سکتا، مقدمہ میں فن سیرت کی ایسی لاجواب بحث ہے جس سے ہر اہل علم کو واقف ہونا چاہئے، دعوت اسلام کے مدارج، کتاب المغازی، کتاب الاموال، کتاب الوفود، کتاب الحج وغیرہ بے شمار مستقل اور مکمل مضامین ہیں جو بڑی تحقیق اور بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

اصح السیر کا حصہ اول (۴۸۰) صفحات پر خوبصورت کتابی سائز میں، نہایت اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر، نفیس کتابت اور خاص اہتمام سے طبع ہو کر شائع ہوا ہے، قیمت صرف چار روپیہ للعہ ہے، اور (۲۵) جلدیں یا زیادہ ایک ساتھ خریدنے والے صاحبوں کو کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔

(نوٹ) ایک کتاب کا وزن ایک سیر سے زیادہ ہے، اس لئے صرف کتاب کا محصول بغیر رجسٹری کے ۸ آنہ ہو جاتا ہے، اگر ایک جگہ کے زیادہ حضرات ملکر ریل سے طلب فرمائیں تو محصول بہت کم ہو جائیگا

مصنف سے طلب کیجئے پتہ یہ ہے :—

مولانا حکیم ابو البرکات عبد الرؤف صاحب داناپوری ۲۹/۲ چونا گلی کلکتہ